

انشائیے

کوتاہیاں

ایس معشوق احمد

مخدوم و محسن سلیم سالک صاحب

کی خدمت میں ہدیہ

ا۔م۔احمد

3-12-23

کوتاہیاں

(انشائیے)

ایس معشوق احمد

جی۔این۔کے۔پبلی کیشنز

KOTAHIYAN

by

S. MASHOOQ AHMAD

Year of 1st Edition 2023
ISBN 978-93-91606-65-7
Price Rs. 300

نام کتاب	:	کوتاہیاں
مصنف	:	ایس معشوق احمد
طبع اوّل	:	2023
صفحات	:	128
قیمت	:	300 روپے
تعداد	:	500
سرورق	:	نعیم یاد
مطبع	:	جی۔این۔کے پرنٹرس، نئی دہلی

Published by

GNK PUBLICATIONS

Head Office : Near Old Bus Stand, Kumar Mohalla
Charari Sharief, Budgam - 191112 (J&K)
Mobile : 7006738304, 9541123110
E-mail : gnkpublications@gmail.com
www.gnkpublications.com

انتساب

اس ڈھال کے نام

جو

ماں باپ

کی دعاؤں سے بنی ہے

اور

مجھے ہر آفت کے وار سے بچاتی ہے۔

باپ زینہ ہے جو لے جاتا ہے اونچائی تک
ماں دعا ہے جو صدا سایہ فگن رہتی ہے
سرفراز نواز

نام : ''معشوق'' ہے لیکن قسم لے لو جو آج تک میں کسی کا ''معشوق'' بنا ہوں۔ جس نے بھی بنانا چاہا چند دنوں میں اکتا کر چھوڑ گیا۔۔۔۔

پیدائش : کب اور کہاں پیدا ہوا یہ جان کر نہ آپ کا بھلا ہوگا نہ میرا کوئی فائدہ۔ آپ کی مشکلیں آسانی ہوتیں یا میرا دکھ بتانے سے کم ہوتا تو الگ بات تھی۔۔

قد : اکثر میرا قد بحث کا سبب بنتا ہے لیکن میرا قد اتنا بھی چھوٹا نہیں جتنی لوگ طعنہ زنی کرتے ہیں۔ میرا دبلا پتلا بدن بھی بحث کا موضوع اسی طرح رہتا ہے جیسے الیکشن کے دوران حکومت کی بھاگ دوڑ کس کے ہاتھ میں رہے گی گرم خبر رہتی ہے۔

مذہب : اسلام کے علاوہ میرا ایک اور مذہب ہے۔ میں خوبصورتی کی پرستش کرتا ہوں۔ مجھے خوبصورت لڑکی، خوبصورت مناظر، خوبصورت کھانا، خوبصورت رنگ، خوبصورت باتیں، خوبصورت چیزیں، خوبصورت گھر، خوبصورت لوگ اچھے نہیں بہت اچھے لگتے ہیں۔ مجھے کھانا اچھے لگے تو کھانے کے لیے مچل جاتا ہوں، کوئی لڑکی اچھی لگی تو اس سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے اور اچھی لگے تو اسے چومنے کو دل کرتا ہے، اس سے آگے میرے تصور میں نہیں۔۔۔۔

پسند : کھانے میں مچھلی، مناظر میں خوبصورت آنکھیں اور ادب میں یوں تو میری پسندیدہ صنف انشائیہ رہی ہے لیکن غزل سے مجھے اتنا ہی پیار ہے جتنا اکیس سال کے جوان کو اپنی محبوبہ سے ہوتا ہے۔ جو لطف محبوب کے وصال میں ہے ویسا ہی مزہ مجھے اچھی غزل پڑھ کر آتا ہے۔۔۔۔۔۔۔

چڑ : باتونی لڑکی، بدزبان مرد، بے وفا محبوبہ، افسانے کے نام پر انشائیہ لکھنے والا ادیب اور کالم کو انشائیہ کہنے والا قلمکار، بحر سے خارج غزل، جھوٹ بولنے والا پبلشر اور خوشامدی چمچے۔۔۔۔۔

ترتیب



عرض یوں ہے

انسان کتنا ہی نیک اور پارسا کیوں نہ ہو زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر اس سے کوتاہیاں اور غلطیاں ضرور سرزد ہوتی ہیں۔ خاکسار بھی انسان ہے اور مجھ سے بھی آپ امید رکھ سکتے ہیں کہ میں نے بھی کوتاہیاں اور غلطیاں کی ہوں گی۔ انسان سے کوتاہیاں کیوں سرزد ہوتی ہیں اس کی معقول وجہ یہی نظر آتی ہے کہ اسے اپنے عیب اور کوتاہیاں عیب نہیں لگتے بلکہ خوبیاں نظر آتی ہیں۔ کوتاہیاں انسان کو رسوا اور بدنام کرنے کا سبب بنتی ہیں۔ میری پہلی کوتاہی ''میں نے دیکھا'' تھی۔ آپ کے ہاتھوں میں یہ میری تیسری کوتاہی ہے جو ڈرتے ڈرتے اور سہم سہم کر آپ قارئین کی نظر کر رہا ہوں۔ پہلی کوتاہی میں شامل مضامین شاید وہ انشائیے ہوں اور کچھ عزیزوں کا ذکر تھا امید ہے وہ خاکے ہی ہوں گے۔ اس کوتاہی میں بھی وہی روش وہی غلطیاں اور ویسا ہی کچھ ہے۔ ان مضامین میں مزاح کی خوبیاں بھی ہوں گی اور طنز کی خامیاں بھی۔ کچھ اچھے مضامین جو لائق بیٹے کی طرح آنکھوں کو ٹھنڈک دیتے ہیں اور کچھ برے مضامین نالائق بیٹے کی طرح آنکھوں میں کرچیاں بھر رہے ہیں۔ ان مضامین میں آپ کو مرزا کا کردار نظر آئے گا اور آپ کو ضرور یہ جاننے کی خواہش ہوگی کہ یہ مرزا کون ہے؟ آپ سے پہلے بھی اکثر لوگوں نے مجھ سے یہ سوال کیا ہے کہ ''یہ مرزا کون ہے؟''۔ چند ایسے بھی ہیں جن کو یہ غلط فہمی ہے کہ مرزا شاید برصغیر کے عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خان غالب ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو سوچتے ہیں کہ مرزا مشتاق احمد یوسفی سے مستعار لیا ہوا کردار ہے۔ حضور سچ تو یہ ہے کہ میں غالب سے ازحد متاثر ہوں لیکن ایمانداری سے میں یہ

اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے غالب کو سنجیدگی سے نہیں پڑھا ہے۔ غالب کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے کشادہ ذہن ہونا چاہیے۔ ابھی مجھ میں وہ ذہنی کشادگی، بصارت اور بصیرت نہیں آئی کہ میں غالب کا دیوان ہاتھ میں لوں اور حق ادائی کر سکوں۔ مشتاق احمد یوسفی سے میں متاثر بھی ہوں اور ان کو تھوڑا پڑھا بھی ہے۔ ان کی حق ادائی اگر نہ بھی کر سکا تو وہ برا نہیں مانیں گے کیونکہ وہ مزاح نگار ہیں اور ایک مزاح نگار سنجیدہ باتوں کا ستیاناس اور غیر سنجیدہ گفتگو کو اہمیت دینا جانتا ہے۔ اسے پتا ہوتا ہے کہ ہنسانا کیسے ہے اور رلانا کیسے۔ بہر حال میں مرزا پر آتا ہوں۔ میرا یقین کیجیے مرزا نہ مرزا غالب ہیں اور نہ ہی مشتاق احمد یوسفی کا تخلیق کردہ کردار۔ مرزا ایک بھولا بھالا اور عام سا انسان ہے جس کو زمانے نے نہ ابھرنے دیا ورنہ اس کی باتیں تو اس لائق تھیں کہ وہ کسی کا بھی دل جیت لیں۔

مرزا کا پورا نام مرزا مشہور مشوری ہے۔ یہ مشورہ دینے میں مشہور ہے۔ میرے ہم سن ہیں اسی لیے میں اس کے عادات واطوار سے واقف ہوں۔ معمولی شکل وصورت، قد پانچ فٹ پانچ انچ کے قریب، گال پچکے ہوئے، بال سفید، چال بے ڈھنگی، عمر اتنی ہوگئی ہے کہ ہر دوشیزہ کو محبوبہ بنانے کی نیت نہیں رکھتے بلکہ بیوی بنانے کی نظر سے دیکھتے ہیں اس لیے بغور جائزہ لیتے ہیں اور اندازہ کر لیتے ہیں کہ بچوں کی پرورش اور شوہر کا خیال رکھنے کی خصوصیات سے مزین ہیں یا نہیں۔ ہو بہو اپنی صورت اور عادات پر گئے ہیں۔ مرزا کو اکیلے رہنے کی عادت ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر گہری سوچ میں ڈوبے رہتے ہیں۔ شور وغل سے نفرت اور لڑائی جھگڑے سے دور رہنا مجبوری بھی ہے اور فطرت بھی۔ کبھی کسی کا برا نہیں سوچا کہ برا سوچنے سے سوچ بری ہو جاتی ہے اور شخصیت پر اثر پڑتا ہے۔ اکثر پریشان رہتے ہیں اور پریشانی میں کھری کھری اور سچی باتیں ایسے دہراتے ہیں جیسے کوئی شعلہ بیان مولوی جوش تقریر میں لوگوں کو گناہوں سے بچنے کی تنبیہ کرتا ہے۔ مرزا کی عمر اگر چہ زیادہ نہیں لیکن سوچ بوڑھی ہو چکی ہے۔ کسی کو متاثر کرنے کا کوئی ہنر اور گر نہیں رکھتے۔ کچھ لوگوں کو مرزا کی باتیں پسند آتی ہوں گی تو وہی کچھ لوگوں کو اس کی باتوں سے اختلاف ہوگا۔ پسند کرنے والے بھی اپنی جگہ صحیح ہیں اور اختلاف کرنے والے بھی کچھ اصولوں کے

تحت ہی اختلاف کرتے ہوں گے۔ مرزا کو کسی سے کوئی شکوہ، کوئی شکایت نہیں۔ کہتے ہیں کہ کسی کو آم پسند ہیں تو کسی کو انگور ہر ایک کی اپنی پسند ہے کسی کی پسند میں رخنہ انداز ہونا اچھی عادات نہیں۔

مرزا کو نصیحت کرنے والوں سے نفرت اور ہنسی مذاق کرنے والوں سے الفت ہے لیکن خود لوگوں کو نصیحتیں کرتے پھرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف نصیحت ہی کرتے ہیں بلکہ مذاق ایسے کرتے ہیں جیسے کوئی شاعر بغیر رکاوٹ مشاعرے میں اپنا کلام پڑھتا ہے۔ چپ چاپ، گم صم بیٹھے رہتے ہیں لیکن آنکھیں کھلی رکھتے ہیں۔ شور وغل، بدتمیزی، اور انگریزی زبان سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی سیاست دانوں، فحش عورتوں اور خود غرض دوستوں سے ہے۔

مرزا کا ذکر ہو گیا اب میں اس کتاب پر آتا ہوں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس کتاب کا نام کوتاہیاں کیوں ہے؟۔ اس لیے کہ اس دور میں وقت نکال کر کچھ لکھنا اور پھر کتابی صورت میں سامنے لانا کوتاہی کے سوا کچھ نہیں۔ بعض کوتاہیوں پر سوچنے سے پچھتاوا ہوتا ہے اور بعض پر انسان مسرت کا اظہار کرتا ہے۔ یہ کوتاہی ملے جلے احساسات کی ترجمانی کر رہی ہے۔ اس کا خیال آتے ہی مسرت ہوتی ہے، پچھتاوا بھی ہو سکتا ہے لیکن پڑھنے والوں کو۔ میں بھی خوش نہیں ہوں وفا کر کے کیونکہ اپنے خرچے سے جو یہ کتاب چھاپنے جا رہا ہوں۔

عرض مصنف معافی نامہ ہوتا ہے ان غلطیوں کا جو کتاب میں در آئی ہوں اور لکھاری سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ مستقبل میں پھر ان کا ارتکاب کرے گا۔ اس میں ان تمام دوستوں، محسنیں، معاونیں اور ناشر کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے لیکن ان تمام کا شکریہ ادا کرنا واجب نہیں کیونکہ آج کل بنا مطلب کوئی کسی کے کام نہیں آتا۔ آج کل بقول نظیر ـــــ

''سودا نقد ہے ایک ہاتھ لے ایک ہاتھ دے''

بہر کیف کچھ نام یاد آ رہے ہیں جن کا شکریہ ادا کرنا لازمی اور ضروری ہے جن میں پروفیسر غیاث الرحمٰن صاحب، پروفیسر خورشید صاحب، ڈاکٹر منظفر نازنین صاحبہ، ڈاکٹر

فریدہ بیگم صاحبہ، شمع اختر انصاری صاحبہ، اقراء یونس صاحبہ اور نعیم یاد صاحب شامل ہیں۔ میں ان تمام قارئین کرام کا شکریہ ادا کر رہا ہوں جو اس کتاب کو پڑھ رہے ہیں۔ بہت شکریہ ان حضرات کا بھی جو اسے پڑھ کر اپنی آراء سے نوازیں گے اور بے حد شکر گزار ان حضرات کا ہوں گا جو میری کوتاہیوں کی نشاندہی کریں گے۔ اس کتاب کو پڑھنا ضرور ورنہ آپ کو کیسے پتا چلے گا کہ کیسی کیسی کوتاہیاں مجھ سے سرزد ہوئی ہیں۔

طالب دعا

ایس معشوق احمد



معشوق احمد: ایک سحر بیان انشائیہ نگار

معشوق احمد کو میں آٹھ سالوں سے جانتا ہوں۔ان سے میری پہلی ملاقات کشمیر یونیورسٹی میں ہوئی۔وہاں ایک شریف اور شرمیلے لڑکے سے جب میں نے نام اور پتہ پوچھا تو اس نے شرماتے اور ہچکچاتے ہوئے کہا کہ میرا نام معشوق احمد ہے اور میں کولگام میں رہتا ہوں۔میں خوش ہوا کہ اپنے ہی علاقے کا لڑکا ہے۔جب ملاقاتوں میں شدت آئی، بے تکلفی بڑی تو اس کی ہچکچاہٹ دور ہوئی۔باتوں باتوں میں مجھے علم ہوا کہ میاں شاعری بھی کرتے ہیں۔ایک دو بار اس کی کاپی دیکھنے کا اتفاق ہوا تو حیرانی ہوئی کہ جس کو میں شرمیلا لڑکا سمجھتا ہوں یہ تو اچھی خاصی شاعری کرتا ہے۔اسے اگر اچھا استاد مل گیا جو اس کے کلام کی نوک پلک سنوارے گا تو اغلب ہے کہ اردو کو ایک اچھا شاعر مل جائے گا۔وقت کا گھوڑا بہت تیز دوڑ رہا ہے۔یہ سب جیسے کل کی بات ہے۔یہ کچھ باتیں اس شاعر کے بارے میں تھیں جواب شاعری بھول گیا ہے۔اب تو معصوم اور شرمیلا معشوق نثر لکھتا ہے۔ہمارا پیارا معشوق شاعر تھا لیکن ایس معشوق احمد مضامین لکھتا ہے، کالم نگار ہے، خاکہ نگار ہے اور سب سے بڑھ کر انشائیہ لکھتا ہے۔پچھلے سال ان کے انشائیوں اور خاکوں کا مجموعہ ''میں نے دیکھا'' بھی منظر عام پر آچکا ہے۔احمد فراز کا شعر ہے

میں نے دیکھا ہے بہاروں میں چمن کو جلتے
ہے کوئی خواب کی تعبیر بتانے والا

ایس معشوق احمد کی کتاب میں بھی آگ، جلن، خزان کا پرتو اور ماتمی سماں دیکھنے کو

ملتا ہے۔میں آٹھ سال پہلے بھی حیران تھا آج بھی حیرانی برقرار ہے کہ اس ننھی سی جان کے ہاتھ میں جب قلم آتا ہے تو کس قدر تلخی، طنز اور کڑواہٹ تحریروں میں آتی ہے۔اس نوجوان لکھاری کی کتاب میرے زیر مطالعہ رہی ہے جس کو انہماک انٹرنیشنل پبلی کیشنز نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔اس میں بارہ انشائیے اور چھ خاکے شامل ہیں۔کتاب میں شامل انشائیے پڑھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نوجوان لکھاری میں انشائیہ لکھنے کا سلیقہ اور صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔اس کی نظر روزمرہ زندگی کے معاملات اور اردگرد کے حالات پر گہری ہے۔اس کی تحریروں میں ہلکا پھلکا طنز، مزاح کی چاشنی اور اس کا اپنا انداز فکر ونظر دکھائی دیتا ہے اور یہ آسان اور طنزیہ جملوں سے قارئین کو متوجہ کرنے کا ہنر جانتا ہے۔یہ بڑی خوش اسلوبی اور ہنرمندی سے اپنے احساسات کو قرطاس پر منتقل کر دیتا ہے۔اسے حکمت اور حماقت کی باتوں کو لکھنے کا فطری ملکہ حاصل ہے۔''میں نے دیکھا'' اس کی پہلی کتاب ہے اور میں وثوق سے کہتا ہوں کہ اس نے اچھی ابتداء ہے۔

معشوق کا فطری میلان صنف انشائیہ کی طرف ہے۔ان کے انشائیوں کا خاص وصف لطافت، شگفتہ، صاف اور سہل انداز بیان ہے۔یہ روکھے پھیکے انداز میں اپنی تحریر سے قاری کو بور نہیں کرتا بلکہ مزاحیہ انداز اپنا کر قاری کو اپنا ہم خیال بنالیتا ہے اور قاری ان کی تحریروں کو پڑھ کر مسرت سے ہمکنار ہوکر سوچنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔یہ اپنے انداز بیان سے شروعات میں ہی قاری پر سحر کرتا ہے اور قاری آخر تک اس کی سحر بیانی سے باہر نہیں آپاتا۔ان کا انداز اچھوتا بھی ہے اور انوکھا بھی، وہ چونکاتا بھی ہے اور شگفتہ بیانی سے مسرور بھی کرتا ہے۔ان کے یہاں جو بھی موضوع آیا ہے اس کی مختلف پرتیں کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے۔مجھے یقین کامل ہے کہ باذوق قارئین ان انشائیوں اور خاکوں کو پڑھ کر آن واحد میں ایس معشوق احمد کی انشائیہ نگاری اور انداز بیان پر فریفتہ ہوجائیں گے کیونکہ معشوق کشمیر کی ادبی فضا کی سوگند اور ہمارا قیمتی سرمایہ ہے۔میں ایس معشوق کے قلم سے بکھرے چند موتی سنجیدہ بصارتوں کی نذر کرتا ہوں تاکہ آپ کو اندازہ ہوجائے کہ میں کیوں انہیں ادبی فضا کی سوگند کہہ رہا ہوں جو چارسو اپنی خوشبو بکھیر رہا ہے۔

''کشمیر میں دیگر ممالک کی طرح چوراچھکے، رشوت خور و بے ایمان، ضمیر فروش اور بد دیانت وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ ایسا نہیں یہاں صرف ان کی کھیپ تیار ہے بلکہ ایماندار، باضمیر، دیانتدار لوگوں کی بھی اچھی خاصی تعداد ہیں۔ پوری دنیا میں جھوٹ کی عمارتیں بلند و بالا ہیں۔ یہاں بھی جھوٹ سے بنی دس دس منزلہ عمارات کھڑی ہیں۔ ہر دفتر اور ہر محکمے میں جھوٹ کا چلن ہے۔ اس کے بغیر چارہ نہیں اور نہ ہی کوئی کام مکمل ہوتا ہے۔ یہاں جو سچ بولتا ہے اس کو طعنے دے دے کر جھوٹ کا لباس پہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ یہاں جھوٹ کی سیدھی راہ پہ چلنے والے ہشاش بشاش ہیں۔ رشوت کو یہاں ''چائے'' بولتے ہیں۔ اس کا لینا اور دینا حلال سمجھا جاتا ہے۔ جو نہیں لیتا اس کو اس اصول پہ چلنے کے لیے آفیسر سے دباؤ آتا ہے کہ بھائی ''لو اور لینے دو'' کا اصول اپناؤ تم بھی خوش، ہم بھی خوش، ہم سب خوش۔''

(کشمیر میں سب کچھ ہے پیارے۔ صفحہ 29)

''بزرگوں کا فرمان ہے کہ شعراء حضرات کو شادی ضرور کرنی چاہیے بیوی اچھی ملی تو زندگی اچھی ہو جائے گی ورنہ شاعری اچھی ہونے کے امکانات روشن ہیں۔ شعراء کو اس قول میں فائدہ نظر آیا اور جب یہ خبر ان کے کان پڑی وہ فوراً اس پر عمل پیرا ہوئے اور گھوڑی چڑھنے کی تدبیریں کرنے لگے۔ بعض شعراء تو یہ قول سن کر اپنے حواس کھو بیٹھے اور وہ قبول ہے، قبول ہے کے فلک شگاف نعرے بلند کرنے لگے۔ کچھ نے تین مرتبہ ہی قبول ہے کا ورد کیا تو کچھ نے چھے مرتبہ۔ کچھ نے بڑا شاعر بننے کی ٹھانی تھی تو انہوں نے اپنی شاعری کو درست سمت عطا کرنے اور سنوارنے میں نو مرتبہ قبول ہے کا ورد کیا۔ شاید کد خدائی کا ہی یہ نتیجہ نکلا کہ اقبال کا شمار اردو کے بڑے شعراء میں ہوتا ہے اور انہوں نے شاعری میں اپنا الگ اور

بلند مقام پایا۔"

("شاعر اور بیوی" __ صفحہ 44)

"کچھ نام تبرکاً لیے جاتے ہیں اور کچھ طنزاً۔۔۔تبرکاً محبوبہ کا نام لیا جاتا ہے اور طنزاً بیوی کا۔ کچھ نام اسم بامسمّٰی ہوتے ہیں اور کچھ معنی کے لحاظ سے ضد۔ نام کا شخصیت پر کیا اور کیسا اثر ہوتا ہے فرض کیجیے اگر کسی کا نام ہمت خان ہے ضروری نہیں وہ ہمت والا اور بہادر ہوگا۔ ہمت خان نام رکھنے والا شخص بزدل اور کم ہمت بھی ہوسکتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہمت خان ہمت کا پتلا اور بہادری کا مجسمہ ہوتا لیکن ایسے جو ہر کہاں دیکھنے کو ملتے ہیں کہ نام اور کام میں مطابقت ہو۔"

("کچھ ناموں کے بارے" صفحہ 56)

"میں نے دیکھا" میں گالی، کشمیر میں سب کچھ ہے پیارے، چوری، شاعر اور بیوی، کچھ ناموں کے بارے میں، ڈرنا، مرزا غالب کے خلاف مقدمہ، جیسے خوبصورت انشائیوں کے علاوہ بچوں والی عصمت، ہلکی پھلکی شازیہ اور لمبا صاحب جیسے خاکوں میں بھی مزاح کے پھول کھلتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً_

"سنا ہے کہ عصمت کی شادی ہوگئی ہے اب وہ کسی اور کی عصمت ہے اور شعبان_ شعبان کا کیا ہے ابھی کنوارہ ہے اور امید ہے کہ کنوارہ ہی مرے گا۔ عصمت نے شادی سے پہلے مجھے لکھا تھا کہ "میں تو کو بھی ٹاک سا" شادی پہ بلانا تو در کنار جب سے شادی کی تب سے مجھ سے "ٹاک" تک نہیں کی۔ اس کا کس کو افسوس ہے کہ وہ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتی، پہلے کون سی ہم دونوں کے درمیان ہر روز باتیں ہوا کرتی تھیں۔"

(خاکہ "بچوں والی عصمت" صفحہ 85)

"آٹھ نو سال پہلے ماضی کی طرف جھانکتا ہوں تو بہت سارے چہرے یاد آتے ہیں جن میں ایک گول مٹول چہرہ، ناک ونقشہ چہرے کے

عین مطابق، آنکھیں نہ زیادہ بڑی نہ چھوٹی، نام شازیہ تھا۔ بعض صحت مند لڑکیوں کو لوگ موٹی کا خطاب دیتے ہیں صرف اس وجہ سے کہ وہ تندرست اور صحت مند ہوتی ہیں۔ شازیہ موٹی تو نہ تھی موٹی کہنا تندرستی کی توہین ہوگی۔ شاندار اور جان دار تھی۔ جن لوگوں نے شازیہ کو دیکھا ہوگا ان کو پتا ہوگا کہ وہ کتنی ''ہلکی'' اور کتنی ''پھلکی'' تھی۔''

(خاکہ ''ہلکی پھلکی شازیہ'' صفحہ 95)

ایس معشوق احمد کو میں نوجوان نسل کا نمائندہ انشائیہ نگار مانتا ہوں۔ ان کا وژن، معاشرے کی سچائیوں کو بلند تخیلی سے بیان کرنے کا ہنر، طنزیہ مزاحیہ انداز اور منفرد خیالات کو نثری قالب میں ڈھالنا قابل توجہ ہے۔ ان کے یہاں موضوعات میں تنوع اور انفرادیت قارئین کو مرغوب کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس کے لکھنے کی رفتار تیز ہے اور اسی رفتار سے ادبی حلقوں میں معروف بھی ہو رہا ہے۔ اس کے تنقیدی مضامین، سماجی کالم اور افسانے بھی دلچسپ ہوتے ہیں۔ وادی کشمیر کے ادباء اور شعراء کے بارے میں انہوں نے خوبصورت تعارفی وتنقیدی مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا جو جاری ہے اور اس سلسلے کو کافی شہرت ملی کیونکہ ان مضامین کا اسلوب رواں اور دلکش ہے۔ اب ان کے انشائیوں کا ایک اور مجموعہ ''کوتاہیاں'' کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے۔ اس میں چند بہترین انشائیے عمر پوچھنا، خوشامد، شادی شدہ اور کنوارے، دوست دشمن اور بیوی، کیا کرتے ہو، بس چار دن شامل ہیں۔ ان انشائیوں کی زبان ہی پرلطف نہیں بلکہ معشوق نے مسکرانے کا سامان بھی ان میں مہیا کیا ہے۔ میں خوش ہوں کہ معشوق کی کتاب منظر عام پر آ رہی ہے اور مسرور ہو کر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ رب ذوالجلال معشوق کو شہرت و ناموری کی بلندیاں نصیب فرمائے۔ آمین

پروفیسر خورشید احمد



''مرزا کہتے ہیں اور معشوق سنتے ہیں''

معشوق صاحب کی اکثر و بیشتر تخلیقات اخبارات ورسائل کی بدولت نظر نواز ہوتی ہیں اور فیس بک فورمز پر مطالعے میں رہتی ہیں۔ان کے مضامین میں تحقیق وتنقید کا گہرا عنصر پایا جاتا ہے جہاں بیساختگی، برجستگی اور سچ کو اجاگر کرنے کی حتی الامکان کوشش ضرور رہتی ہے۔

انشائیہ پر ان کی کتاب منظر عام پر آرہی ہے جہاں مختلف النوع مضامین کو انشائیہ کی طرز پر لکھنے کی بہترین سعی کی گئی ہے۔''انشائیہ'' دراصل ہلکا پھلکا مضمون، بات میں بات پیدا کرنا اور اشاروں ہی اشاروں میں اپنی بات کہہ جانا۔کبھی کبھی مزاح کی چاشنی زیرلب تبسم کی لہر کے ساتھ مضمون موضوع کی مناسبت سے متاثر کن انداز میں پیش کیا جاتا ہے جس میں شگفتگی، تازگی اور ندرت کا ہونا ضروری ہے۔بے ربط تحریر اپنے شعور آگہی سے ربط مسلسل کے ساتھ قاری کے ذہن میں اتر کر احساس کراتی ہے کہ اس موضوع پر غور وفکر کی ضرورت ہے۔

وزیر آغا رقم طراز ہیں کہ۔۔

''بنیادی طور پر انشائیہ لکھنے کا مقصد آپ کو سوچ بچار کے لیے راستہ ہموار کرنا ہے، بیشک وہ اپنے موضوع کے بیان میں صرف شخصی واردات اور تجربات اور اپنے ذاتی عمل کے اظہار تک ہی اپنی مساعی کو محدود رکھتا ہے۔تاہم اس کے پیش نظر مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ آپ کو سوچنے پر مائل کرے، چنانچہ ایک اچھے انشائیہ کی پہچان یہ ہے کہ آپ اس کے مطالعے

کے بعد کتاب کو چند لمحوں کے لیے بند کر دیں گے اور انشائیہ میں بکھرے
ہوئے بہت سے اشارات کا سہارا لے کر خود بھی سوچتے اور محظوظ ہوتے
چلے جائیں گے''

(انشائیہ کے خدوخال۔۔۔وزیر آغا، صفحہ نمبر 11-12)

جہاں تک معشوق صاحب کے انشائیوں کی بات ہے ان میں وہ مرزا کے اقوال کے ذریعے اپنی بات رکھتے ہیں اور بات میں بات پیدا کر قاری کو محظوظ کراتے ہیں۔ تخیلی فضا میں تخلیقی کاری گری سے بظاہر سادہ سی بات سے محظوظ کرانے کا گمان ہوتا ہے مگر درون متن باطن میں مشاہداتی تجرباتی فضا ہوتی ہے۔

''مرزا کہتے ہیں کہ کنوارے کو یہ آزادی ہے کہ وہ اپنی محبوباؤں کا
ذکر کر سکتا ہے اور اس ذکر سے جان کو خطرہ نہیں ہوتا۔ شادی شدہ محبوبہ کا
ذکر کرے تو سر پھوٹنے کے قوی امکان ہے۔''

کس قدر پر لطف مزاح پیدا کیا ہے جہاں قاری واقعی سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

''مرزا سے پوچھا گیا کہ بادشاہ اور غلام میں کیا فرق ہے قربان جاؤں
اس کی ذہانت و فطانت پر اس نے تاریخی جملہ کہا کہ جو فرق کنوارے اور
شادی شدہ میں ہوتا ہے۔ دو ہی زمانے بادشاہی اور بے فکری کے ہوتے
ہیں بچپن اور جوانی کے وہ دن جو کنوارے گزرے ہوں۔ شادی کے بعد
میاں بیوی میں ان بن ہو جائے تو طلاق کی نوبت آتی ہے جو رسوائی اور
بدنامی کا سبب بنتا ہے۔ کنوارے کو رسوائی کا غم ہے نہ بدنام کا خوف وہ
شادی کرے کو کھٹکا لگے ورنہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔۔۔!''

ان کے مضامین اصلاح معاشرہ کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں اور قاری غور وفکر کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔

''بندہ کنوارا مر جائے تو قوی امکان ہے کہ جنت میں جائے کیونکہ وہ اپنی ماں کو
زبان درازی، واہیات خیالات اور ان گالیوں سے بچاتا ہے جو وہ دوران ساس بہو کی

مہابھارت کے موقع پر اپنی بہو کو دینے جا رہی تھی۔ اتنا ہی نہیں وہ ماں کے تقدس اور مرتبہ کو بھی پامال ہونے سے بچاتا ہے نہ وہ شادی کرتا ہے اور نہ ہی وہ آفت گھر میں آتی ہے جو اس کی ماں کو گالیاں دیتی، کوستی، ناروا سلوک کرتی اور لعن طعن کرتی ہے۔''

اس مضمون کے ذریعے معرکہ عرض ہنرمندی کے ساتھ انشائی مہک سے منور کیا ہے۔

ان کا ایک اور انشائیہ ''عمر پوچھنا'' بہت دلچسپ ہے اور بہت حد تک سچائی پر مبنی ہے۔ کسی لڑکی یا خاتون کی عمر پوچھنا اور جواب حاصل کرنا مرد شیر ہی کا کام ہے جس میں ہمت ہو وہی یہ کام بخوبی انجام دے سکتا ہے۔ دور حاضر میں عورت تو عورت مرد بھی عمر کو صیغہ راز میں رکھنا پسند کرتے ہیں۔ اس مضمون میں تجربات و مشاہدات کی جزئی تفصیلات نے زیر لب تبسم کی لہر پیدا کی۔

> ''مرزا کہتے ہیں کہ خوبصورت خاتون اور بدمعاش مرد ایک جیسے ہوتے ہیں کہ دونوں میں یہ بات مشترکہ ہے کہ دونوں جلد بوڑھے نہیں ہوتے۔ دنیا میں اور بھی تو ہزاروں مسائل اور لاکھوں معاملات ہیں جن پر ہم نے لب نہ کھولیں اور سوالات نہ کیں لیکن جب ہماری نظر عورت پر پڑتی ہے تو فوراً دل مچل جاتا ہے اور ذہن بیدار ہو کر اس سے عمر پوچھنا کی ضد کرتا ہے۔ مشہور یہ ہے کہ عورتیں اپنی صحیح عمر کبھی نہیں بتاتی لیکن تجربہ یہ ہے کہ عورتیں ہی اپنی عمر نہیں چھپاتی بلکہ شاعر اور عمر رسیدہ شخص بھی کبھی اپنی صحیح عمر نہیں بتاتے۔ جب بھی کسی شاعر سے یہ سوال پوچھا گیا کہ آپ کی عمر کتنی ہے گول مول کر کے جواباً یہی کہتا کہ ـــ
>
> عمریں دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
> دو آرزو میں کٹے گئے دو انتظار میں''

اس انشائیے میں اصلاحی پہلو باتوں ہی باتوں میں کیسے نکل آتا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

> ''جھوٹ بولنا گناہ ہے لیکن یہ ثواب کے برابر تب ہو جاتا ہے جب اس کے سہارے سے چالیس سال کی عورت تیس کی ہو جاتی ہے اور

پچاس سال کا مرد چالیس کا ہو جاتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ عمر کو چھپانا نہیں
چاہیے کیونکہ چہرے سے عیاں ہوتا ہے کہ اب عمارات کو کھنڈر بننے میں
اور کتنا وقت لگے گا۔ کوئی ایسا سوال نہیں کرنا چاہیے جس سے کسی کی دل
آزاری ہو اور جواب دینے میں بے قراری محسوس ہو۔ کسی کے جذبات
مجروح کرنا اور دل دکھانا گناہ ہے اور یہ جرم کی صورت تب اختیار کر جاتا
ہے جب کسی سے عمر پوچھی جاتی ہے۔''

زندگی کی ڈگر پر تجربہ کی کارگاہ مینا میں جمال شوقی نے تخیل کے پرواز کو ایک نیا
رخ عطا کیا جو دوست، دشمن اور بیوی کی شکل میں عیاں ہوا۔ ملاحظہ فرمائیں کہ زندگی میں ان
کی اہمیت اور ضرورت سے کسی کو انکار نہیں__

''ہر شخص کی زندگی کو بنانے، سنوارنے اور بگاڑنے میں تین لوگوں
کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ان تینوں کے طفیل گرد وغبار میں اٹا شخص تختہ مینا تک پہنچ
سکتا ہے اور ان ہی کی بدولت انسان طاوس آتش پر سے گر کر خاک میں
راکھ کی مانند گھل مل سکتا ہے۔ ان تین ہستیوں میں دوستوں کی قربت،
دشمنوں کی نفرت اور بیوی کی الفت شامل ہے۔ پروردگار کے حسین وجمیل
تحفوں میں سے انسان کے لیے ایک تحفہ خاص نیک اور پاک سیرت
دوست کا ہے۔ اس کی صحبت میں انسان نہ صرف نیک اور پارسا بن سکتا
ہے بلکہ ان تمام لذتوں سے محروم ہو سکتا ہے جو گناہ میں پوشیدہ ہے۔ مرزا
کہتے ہیں کہ نیک سیرت دوست کی صحبت میں بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ نہ
صرف اچھے کاموں کی ترغیب دیتا ہے بلکہ عین جوانی میں برے کاموں
سے روکنے کا فرمان بھی جاری کرتا ہے جو اس ظالم بادشاہ کے حکم سے کم
نہیں جس نے بادشاہ بنتے ہی خوبصورت عورتوں کو دیکھنے سے منع کیا ہو''

ایسے مضامین خاص مشاہدہ اور تجربہ کے غماز ہوتے ہیں جس کے ہر جملہ پر قاری
حمایت میں سر ہلاتا رہ جاتا ہے یہ اپنے تخلیقی ہنر کا کمال ہے۔

ان کی اس تخلیق میں ایک کڑوا سچ بھی ہے جس کا سامنا معاشرہ کے افراد کو ہوتا رہتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں ــــ

"زندگی کے جلوے دوست اور بیوی سے ہیں اور زندگی پر حملے دشمن کی بدولت ہوتے ہیں۔ سچا پکا دوست جو دکھ سکھ میں کام آئے، با اصول دشمن اور بردبار بیوی کا وجود صرف قصوں کہانیوں میں ہی ہوتا ہے اصل زندگی میں ان ہی کا سامنا رہتا ہے جن کا سامنا ہم سب کو ہے۔ کسی بھی فرد کی زندگی میں صرف یہی تین لوگ انقلاب اور بدلاؤ لا سکتے ہیں۔ ان کے سوا نہ کسی کو حق ہے اور نہ ہمت کہ وہ انسان کو پریشان، متحرک، چاق و چوبند، درست اور چست حالت میں رکھ سکتے ہیں۔ جہاں سانپ ڈسنا چھوڑ دیتا ہے وہاں سے دشمن ڈنک مارنے کی کوشش کرتا ہے۔ جہاں دشمن ناکام ہو جائے وہاں دوست خار چھبو کر اپنا حق دوستی ادا کرتا ہے، جہاں دونوں ناکام ہو جائے وہاں بیوی ہی پھانس کھمبو کر زندگی کو اجیرن بنانے کے لیے کافی ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ صبح شام خفیہ دشمن، منافق اور حاسد دوست اور پس قسمت بیوی سے نجات مانگی چاہیے۔ تینوں زندگی کو زہر ناک، غضب ناک، کرب اور اذیت ناک بنا دیتے ہیں۔"

دنیا میں جہاں خیر ہے وہاں شر بھی ہے زندگی کے مختلف رنگ جب سامنے آتے ہیں اور انسان مختلف تجربوں سے گزرتا ہے تو اس کا سامنا بھی مختلف قسم کے لوگوں سے ہوتا ہے زندگی کے خوشگوار لمحات بعض اوقات اپنوں کی وجہ سے ہی ناخوشگوار بن جاتے ہیں ادھار اور گالی کا تجربہ بھی عجیب منظر پیش کرتا ہے کہ ــــ

"مرزا کہتے ہیں کہ گالی سے معاشرے کو پاک کرنے کا ایک راستہ یہ بھی ہے کہ دوستوں کو ادھار دینا بند کیا جائے تا کہ بے ایمانی کا شبہ ہی نہ ہو اور گالی دینے کی نوبت ہی نہ آئے"

ان کے انشائیوں میں بعض بہت عمدہ ہیں اور بعض جگہ پر عام بات چیت اور تجربہ

بیان ہوا ہے جو انشائیہ میں پورے طور پر تحلیل نہ ہو سکا جیسے ادھار اور گالی، شفیق بچولیا وغیرہ۔ خیر انشائیہ لکھنا بھی مشکل فعل ہے۔ ہر تجربہ و مشاہدہ ہنر مندی کے ساتھ ترسیل کرنا اور اسے متاثر کن بنانا کمال ہے ذرا سی چوک ہوئی تو انشائیہ یا تو مضمون میں تبدیل ہو جائے گا یا پھر عام روداد یا عام تجربے میں۔

معشوق صاحب کی کاوش مبارک باد کی مستحق ہے کہ آپ نے بحیثیت انشائیہ نگار بہترین کوشش کی ہے اور حتی الامکان قاری کو محظوظ کراتے ہوئے غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ امید ہے مستقبل میں اس سے زیادہ اہم موضوعات اور منفرد تجربات کے ساتھ جلوہ گر ہوں گے۔ آپ میں لکھنے کی لگن و جستجو خوب ہے جو سراہے جانے کے قابل ہے۔۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

ڈاکٹر فریدہ تبسم
گلبرگہ کرناٹک انڈیا



صنف انشائیہ کا عاشق ''معشوق''

وطن عزیز ہندوستان کے شمال میں جموں وکشمیر ہے۔جموں وکشمیر پر ہم ہندوستانیوں کو بے حد ناز ہے کیونکہ یہ خوبصورت وادی اپنے قدرتی حسن (natural beauty) کی بنا پر پوری دنیا میں مشہور ہے۔کشمیر کے پھل، پھول، زعفران کے لہلہاتے کھیت، بادام، خوبانی، اخروٹ اور میوہ جات پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ہر سال دنیا بھر کے سیاح کشمیر کی خوبصورت وادی کا نظارہ کرنے آتے ہیں۔اس وادی کے لوگ بھی بہت حسین، بے حد خوبصورت اور تیکھے نقش ونگار کے ساتھ کافی لحیم وشحیم ہوتے ہیں۔ان پر قدرت کی نوازش اور خالق کائنات کا کرم ہے کہ جس نے انہیں اتنی خوبصورت وادی سے نوازا ہے۔

ایک طرف وادی کشمیر اپنی خوبصورتی اور حسن کی بدولت پوری دنیا میں مشہور ہے وہیں اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اس وادی میں اردو زبان وادب کو کافی فروغ حاصل ہو رہا ہے۔اس شیریں زبان کی ترقی وترویج میں اس حسین وادی کا اہم رول رہا ہے۔ یہاں ایسے ایسے باصلاحیت نوجوان قلمکاروں نے جنم لیا ہے جنہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے اور ان کی تخلیقات کشمیر کی ادبی فضا کو معطر کر رہی ہیں۔ان ہی جیسے نوجوان تخلیق کاروں میں ایس معشوق احمد کا شمار ہوتا ہے۔ایس معشوق احمد کا تعلق کشمیر کے ضلع کولگام سے ہے۔کولگام کے ایک گاؤں کیلم میں 21 فروری 1992ء میں پیدا ہوئے۔ موصوف نے ایم-اے اردو کشمیر یونیورسٹی سے کیا ہے۔کم عمری سے ہی ادب سے لگاؤ رہا ہے۔اب تک ان کی دو کتابیں ''میں نے دیکھا'' اور ''دبستان کشمیر کے درخشاں ستارے''

منظر عام پر آچکی ہیں۔ میں نے دیکھا انشائیوں اور خاکوں کا مجموعہ ہے جبکہ دبستان کشمیر کے درخشاں ستارے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں وادی کشمیر کے ادباء وشعراء کی حالات زندگی، فن اور کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان دو کتابوں کے علاوہ ایس معشوق احمد نے چالیس کے قریب مختلف شاعروں اور نثر نگاروں کی کتابوں پر تبصرے کئے ہیں اور پچاس کے قریب سماجی نوعیت کے کالم لکھے ہیں۔ یہ تبصرے اور کالم کشمیر سے شائع ہونے والے موقر اخبارات کشمیر عظمیٰ، چٹان، تعمیل ارشاد، ندائے کشمیر، شہربین اور دیگر اخبارات میں شائع ہوئے ہیں۔ موصوف کی تیسری کتاب ''کوتاہیاں'' آپ کے ہاتھوں میں ہیں۔

''کوتاہیاں'' میں جو انشائیے شامل ہیں ان میں رواں اور آسان زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔ ان انشائیوں میں طنز کی کڑواہٹ بھی ہے اور مزاح کی مٹھاس بھی۔ شادی شدہ اور کنوارے، عمر پوچھنا، خوشامد، ادھار اور گالی، دوست دشمن اور بیوی، کیا کرتے ہو؟، بس چار دن جیسے انشائیے پڑھ کر ہنسی بھی آتی ہے اور ایس معشوق احمد کے اسلوب سے لطف اندوز ہو کر بے تحاشہ داد دینے کو بھی جی چاہتا ہے۔ ان انشائیوں کے عنوانات دیکھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ مصنف نے روزمرہ زندگی کا مشاہدہ گہری نگاہ سے کیا ہے اور اپنے آس پڑوس سے اخذ کئے گئے ان مشاہدات اور تجربات کو تخیل کی مدد سے طنزیہ مزاحیہ انداز میں حوالہ قرطاس کیا ہے۔ معمولی نظر آنی والی عنوانات پر لکھنا اور ادب پارے تخلیق کرنا کمال ہے لیکن ایس معشوق احمد کا اصل کمال یہ ہے کہ ان انشائیوں کو پڑھ کر قاری متاثر ہوتا ہے۔ بات بہترین انداز میں تب ہی سمجھ میں آتی ہے جب مثال کے ذریعے سے سمجھائی جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند مثالیں قارئین کی نذر کی جائیں تا کہ وہ جان سکیں کہ ایس معشوق احمد کا انداز بیان کیسا ہے ـــــ

> ''بیوی شوہر کے کارناموں کی کھوج میں لگ جائے تو روز نئی نئی ایجادات سامنے لاتی ہے۔ سائنس کی تحقیق میں کمیاں اور خامیاں ہوسکتی ہے بیوی کی تحقیق میں نہیں۔ جہاں سائنس کی نظر نہیں جاتی وہاں بیوی اور ساس کی نظر جاتی ہے۔ اس تحقیق سے صرف ایک ہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے

وہ ہے کنوارا۔ مزرا کہتے ہیں بیوی کی مار اور زبان کے وار سے صرف ایک مخلوق بچی رہتی ہے وہ ہیں کنوارے۔ شادی شدہ پر بیوی ایسے نظر رکھتی ہے جیسے سرحد پر فوج دشمن کی ہر حرکت اور عمل پر نظر رکھتی ہے۔''

انشائیہ ''شادی شدہ اور کنوارے''

''محنت اور خوشامد سے کیا حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں محنت کے پاؤں آبلہ پا ہوتے ہیں اور انسان تھک ہار کر بیٹھ جاتا ہے وہاں سے خوشامد کی ابتداء ہوتی ہے اور انسان خوشامد سے اس منزل کو حاصل کر سکتا ہے جو اس سے کوسوں درو ہو۔''

(انشائیہ ''خوشامد'')

''اس سوال سے عورتوں کو ہی کوفت نہیں ہوتی بلکہ بعض مرد بھی اپنی صحیح عمر بتانے سے نہ صرف کتراتے ہیں بلکہ گھبراتے ہیں۔ بعض خوش اخلاق ایسے بھی ہیں جو اس سوال کو ہنسی میں ٹال دیتے ہیں اور بعض اس سوال پر تند مزاجی اور چڑچڑاہٹ کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ حقیقت مجھ پر کبھی واضح نہ ہوئی کہ لوگ اس سوال سے برہم کیوں ہو جاتے ہیں حالانکہ چند بدتمیز دوست، کچھ بے خبر رفیق اور ایسے بدنیت انسان بھی موجود ہیں جنہوں نے یہ سوال مجھ سے بھی بارہا کیا۔ مجھے مستورات کی طرح اپنی صحیح عمر بتانے میں اعتراض نہیں اور نہ ہی مجھے اس سوال سے کشش قلبی ہوتی ہے لیکن جب بھی مجھ سے کوئی عمر پوچھتا ہے تو میں سالوں کے بجائے دنوں میں بتاتا ہوں جیسے کہ میری عمر ''نو ہزار آٹھ سو ساٹھ دن'' ہیں۔ عمر پوچھنے والے کے چہرہ پر پریشانی اور پشیمانی کے آثار دیکھ کر میں سمجھ جاتا ہوں کہ میری طرح یہ بھی حساب میں کورا ہے۔ بچارا حیران اور حرماں واپس لوٹ جاتا ہے۔ اگلی ملاقات میں اس کی خوشی دیکھنے لائق ہوتی ہے جب وہ حساب کر کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ لیے سلام علیک کے بعد

وہاں سے ہی بتاتا ہے کہ اچھا تو آپ کی عمر ستائیس سال ہیں۔"

(انشائیہ "عمر پوچھنا")

ڈاکٹر شبنم افشاں ان کے بارے میں لکھتی ہیں کہ ــــ

"ان کی تحریروں میں نفاست اور شائستگی ہے۔ نہ غیر مانوس الفاظ کا استعمال کرتے ہیں اور نہ ہی پیچیدہ اور گنجلک الفاظ۔ ان کے جملے سادہ اور شگفتہ ہوتے ہیں۔ اپنی تحریر کے ذریعے نہ صرف اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں بلکہ مختلف پہلوؤں پر روشنی بھی ڈالتے ہیں"

میں مبارکباد پیش کرتی ہوں کہ کوتاہیاں شائع ہو رہی ہے۔ آخر پر میں ایس معشوق احمد کے حوالے سے اتنا کہوں گی کہ موصوف وادی کشمیر کے ادبی افق پر ابھرتے ہوئے ستارے ہیں اور اسم با مسمی ہیں، جیسا نام ویسے صفات۔ میں بارگاہ ایزدی میں سربسجود ہو کر دعا کرتی ہوں کہ پاک رب سرزمین کشمیر کے اس ابھرتے ہوئے ستارے کو سارے عالم میں روشن اور تابندہ کرے اور مستقبل میں ان کی عالمی سطح پر شناخت ہو۔ ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ خدا کرے زور قلم، زور فہم، زور سخن اور زیادہ۔ میں شاعر کا یہ مصرعہ ان کی نذر کرتی ہوں۔

"تجھ کو جانا ہے بہت اونچا حد پرواز سے"

ڈاکٹر مظفر نازنین کولکاتا



معشوق احمد: لفظوں کا ساحر

میرے سامنے معشوق احمد کے تحریر کردہ چند انشائیے موجود ہیں۔ان کا نام بڑا خوبصورت ہے۔ پہلے مجھے شک ہوا کہ یہ نسوانی نام ہے۔ تحقیق کے بعد پتا چلا کہ یہ مردانہ نام ہے تو خوشی ہوئی۔ ایسی تحریریں جن کا زندگی کے ساتھ براہ راست رابطہ ہو مرد ادیب ہی لکھ سکتا ہے، خواتین کے لیے ایسی تحریریں لکھنا خاصا مشکل کام ہے۔ان کا نام معشوق احمد ہے اور قلمی نام ایس معشوق احمد ہے۔ ان دونا موں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔اردو کی ایک مشہور ادیبہ گزری ہیں بانو قدسیہ۔ بانو قدسیہ ان کا قلمی نام تھا جبکہ اصل نام قدسیہ بانو تھا۔ ہمارے دوست معشوق احمد نے بھی اپنے معشوقانہ نام کے آگے 'ایس' لگا دیا ہے اور یہ اپنا قلمی نام بنا دیا ہے۔ بہر حال نام میں کیا رکھا ہے۔

جب میں ان کی تحریروں کو دیکھتا ہوں تو مجھے بیکن کے مضامین یاد آتے ہیں کہ وہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ایسا ہی ہنر معشوق صاحب کے پاس ہے۔ انہوں نے زندگی کی سچائیوں اور گہرائیوں کو نہایت آسانی کے ساتھ قلمبند کیا ہے اور صفحہ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ بیکن کی ہی طرح معشوق احمد اپنے انشائیوں کا آغاز دلکش اور دلچسپ انداز میں کرتے ہیں۔ آغاز اتنا catching ہوتا ہے کہ قاری پورا انشائیہ پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر انشائیہ ''دوست، دشمن اور بیوی'' _ یہ عنوان بڑا دلچسپ ہے۔ اس کا آغاز دیکھیں __

''ہر شخص کی زندگی کو بنانے، سنوارنے اور بگاڑنے میں تین لوگوں

کا ہاتھ ہوتا ہے۔''

آپ دیکھیں کہ کتنی بڑی بات مصنف نے ایک جملے میں کہہ دی ہے یعنی زندگی کو بنانے، بگاڑنے اور سنوارنے میں ان تین لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ مصنف کو داد دینی پڑے گی کہ انہوں نے کتنی مشکل اور اہم بات کس قدر اختصار کے ساتھ بیان کر دی ہے۔ ان کا ایک اور انشائیہ ہے خوشامد۔ اس کا شروعاتی جملہ ہے کہ __

''خوبصورت بیوی کی چاہ، اچھا کھانا کھانے کی آرزو اور اپنی تعریفیں سننے کا شوق سب کو ہوتا ہے۔''

واقعی ہر شخص تھوڑا بہت narcissist، نرگیست اور love self کا شکار ہوتا ہے۔ اپنی تعریفیں کس کو اچھی نہیں لگتیں۔ انہوں نے جو مثالیں ساتھ دی ہیں وہ بہت خوبصورت ہیں یعنی اچھا کھانا کھانے کی آرزو، خوبصورت بیوی کی چاہ اور اپنی تعریفین سننے کا شوق سب کو ہوتا ہے۔ ہمیں بھی ہے، معشوق صاحب کو بھی ہوگا اور کم و بیش سب کو ہوتا ہے۔ ان کا ایک اور انشائیہ ہے شادی شدہ اور کنوارے۔ اس کا آغاز بھی خوبصورت ڈھنگ سے کرتے ہیں۔ پہلے دیکھیں کہ ان کے انشائیوں کے title (عنوان) بھی بالکل روزمرہ زندگی سے لیے گئے ہیں۔ ان میں کوئی رومانوی انداز نہیں ہے، مافوق الفطری باتیں نہیں کرتے۔ وہ چیزیں جو ہم خود محسوس کرتے ہیں وہی ہم کو پڑھنے کے لیے مہیا کر دی ہیں۔

''ہمارے ہاں جو عمل بیک وقت مقبول اور بدنام ہے وہ شادی ہے۔''

اس جملے میں طنز بھی ہے، مزاح بھی ہے اور سنجیدگی بھی۔ اس جملے میں ہر ایک خوبی دیکھنے کو ملتی ہے۔ جس کا آغاز اتنا دلچسپ ہو تو قاری پورا انشائیہ کیوں نہ پڑھے گا۔ شادی کو وہ مختلف پیرایوں اور زاویوں سے بیان کرتے ہیں کہ یہ ایک ہی وقت میں مقبول بھی ہے اور بدنام بھی۔ انگریزی میں ہم ایک اصطلاح استعمال کرتے ہیں oxymoron یعنی صنعت تضاد جس میں ایک لفظ دوسرے لفظ کا opposite (متضاد) ہوتا ہے۔ جیسے ہم کہہ سکتے ہیں کہ kind and cruel یعنی وہ ظالم بھی ہے اور مہربان بھی۔ ایسی ہی فضا انشائیے میں معشوق صاحب نے قائم کی ہے یعنی شادی بیک وقت بدنام عمل بھی ہے اور

مقبول بھی۔ان کا ایک اور زبردست اور دلچسپ انشائیہ ''ادھار اور گالی'' ہے۔اس کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ مصنف حقیقی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا فن جانتے ہیں۔اس انشائیہ کا آغاز بھی دلچسپ انداز میں ہوا ہے۔

''جتنا قریبی رشتہ میاں بیوی کا ہوتا ہے اتنا ہی گہرا رشتہ ادھار اور گالی کا ہے۔''

مصنف ادھار اور گالی کے رشتے کو یوں قرار دیتے ہیں جیسے میاں بیوی کا رشتہ۔آگے لکھتے ہیں کہ۔۔

''گالیاں خریدنے کا آسان ترین نسخہ یہ ہے کہ آپ کسی عزیز دوست کو ادھار دے دیں۔''

اب یہ آپ کو سارا انشائیہ پڑھنے کے بعد ہی معلوم ہوگا کہ آیا گالیاں خریدی بھی جاتی ہیں اور بندہ گالیاں کیوں خریدے؟ اس سے کیا فائدہ ہوگا؟۔یہ سارے چیزیں سمجھنے کے لیے آپ کو معشوق احمد کے انشائیوں کا مطالعہ ضرور کرنا پڑے گا۔اگر آپ ان کے انشائیوں کا مطالعہ کریں گے تو میں یقین سے کہتا ہوں کہ آپ کے وقت کا زیاں نہیں ہوگا اور آپ کو ہر سطر، ہر انشائیے میں کچھ نہ کچھ نیا سیکھنے کو ملے گا۔

وقار احمد ملک

میانوالی پنجاب پاکستان



یوسفی ثانی ''معشوق''

''ایس معشوق احمد'' ہیں تو عاشق ہی، معشوق بنے پھرتے ہیں اور معشوق بھی بھلا کس کے؟ ''احمد'' کے۔ ہائے معشوق پھر تمہارا نام کامیاب نہ ہو کیسے ممکن ہے۔ عاشقی کی عمر میں معشوق ہونا معتوب ہونے سے یکساں مختلف ہے۔ ایس معشوق احمد صاحب کو پہلی بار فیس بک ''ولر اردو ادبی فورم کشمیر'' پر پڑھا۔ موصوف افسانہ نگاری میں کمال رکھتے ہیں تو انشائیے بھی بڑے ہی جان دار لکھتے ہیں۔ ایسے انشائیے لکھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔

معشوق کی انگلیوں میں قلم نہیں ایک باریک نشتر ہے اور معاشرہ ایک رستا ناسور۔ معشوق انستھیسیا دیئے بغیر زخم کو ہولے ہولے کریدتے ہیں اور تکلیف کی شدت بڑھتے ہی مزاح کا پھایہ رکھ دیتے ہیں اور یوں ہلکے ہلکے طنز کے ساتھ مزاح کو ملا کر ایک روتا ہنستا مضمون تیار ہو جاتا ہے۔ جس میں مرزا بار بار آتے ہیں۔ یہ مرزا کون ہیں۔ مرزا دراصل ایس معشوق کی اندرونی روح ہے۔ جو بات معشوق نہیں کہنا چاہتے، وہ مرزا کی زبانی با آسانی کہلوا دیتے ہیں۔ مرزا پوری تحریر میں معشوق کو لکھتا ہوا دیکھتے رہتے ہیں۔ جہاں معشوق رکتے ہیں وہیں مرزا جی اٹھ کر آتے ہیں اور تحریر کو آگے بڑھا کر اپنی جگہ واپس جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یوں ایک تحریر معشوق کی رفاقت اور مرزا کی لطافت لیے اختتام کی جانب روانی سے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ حد یہ کہ ہوش جب آتا ہے کہ جب انشائیہ ختم ہو جاتا ہے۔ ایسے خوبصورت انشائیے کو ختم نہیں ہونا چاہیے جو وقت گذر جانے کا احساس تک نہ ہونے دے۔

معشوق کے انشائیے انسان کے اندر سانس لیتے ہیں، خیال بن کر ساتھ چلتے ہیں، زندگی کو جیتے ہیں، قطرہ قطرہ زندگی کشید کرتے ہیں اور قاری کو معشوق سے عشق ہو جاتا ہے۔

''دوست، دشمن اور بیوی''میں انسانی زندگی کی عمارت کو ایک تکون پر ایستادہ دکھایا گیا ہے۔انسانی زندگی پر دوست کے دشمن کے اور بیوی کے ثمرات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

دوستوں کی قربت، دشمنوں کی نفرت اور بیوی کی الفت''۔۔۔۔۔

''دوست کا سایا، دشمن کی چھایا، بیوی جیسی مایا''۔۔۔۔

کیا نظمیہ انداز ہے۔۔۔

جو بات معشوق صاحب خود نہیں کہہ سکتے وہ مرزا کی زبانی با آسانی کہلوا دیتے ہیں جیسے ان جملوں پر غور کیجیے۔

''مرزا کہتے ہیں کہ نیک سیرت دوست کی صحبت میں بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ نہ صرف اچھے کاموں کی ترغیب دیتا ہے بلکہ عین جوانی میں برے کاموں سے روکنے کا فرمان بھی جاری کرتا ہے جو اس ظالم بادشاہ کے حکم سے کم نہیں جس نے بادشاہ بنتے ہی خوبصورت عورتوں کو دیکھنے سے منع کیا ہو۔

اس شخص پر خدا کا خاص کرم اور عنایت ہے جس کو ایسے دوست کی صحبت نصیب ہوئی جو واقعی بگڑا ہوا ہو۔دوست بگڑا ہوا مل جائے تو ارمان ہی پورے نہیں ہوتے بلکہ ان سارے گناہوں سے نفرت ہو جاتی ہے اور انسان ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے جن کے جوانی میں ارمان اور بڑھاپے میں حسرت ہوتی ہے۔دوستوں سے بے تکلفی ہوتی ہے اور یہ آزادی بھی کہ گندے سے گندا لطیفہ ان کو سنایا جا سکتا ہے اور وقت ضرورت ننگی سے ننگی گالی ان کو دی جا سکتی ہے۔گویا اخلاق کو بگاڑنے ،کردار کو خراب کرنے اور انسان کو رسوا کرنے کا جو رول ایک بے تکلف دوست نبھاتا ہے وہ کوئی جانی دشمن بھی ادا نہیں کر سکتا۔''

اگر چہ جوانی میں گناہ کرنے میں مزا ہے لیکن اس میں ایک بگڑے دوست کی سنگت۔گویا نشین وہ بھی دو آتشہ۔

''معشوق فریبی''! گناہ تو خود کرنا چاہتا ہے لیکن کس صفائی سے ساری بات مرزا کی زبانی کہلواتا ہے اس انداز تحریر پر بہت داد۔

ایک اور انشائیہ ''عمر پوچھنا''، کیا خوب مشاہدہ ہے معشوق کا۔ باتوں باتوں میں ایک بار پھر لطیف سے طنز کے نشتریوں چلائے گئے ہیں کہ گویا سیدھے سیدھے دل پر وار کیئے گئے ہوں۔

''سب سے بڑی بے ادبی یہ ہے کہ کسی جوان اور خوبصورت عورت سے اس کی عمر پوچھنا۔ ہاں اگر سوال کرنے والا بھی خوبصورت ہو تب وہ برا نہیں مانتی۔ تب اس کا موقف ہوتا ہے کہ __

ہونٹ اچھے ہوں تو سمجھ کہ سوال اچھا ہے

یہ حقیقت مجھ پر کبھی واضح نہ ہوئی کہ لوگ اس سوال سے برہم کیوں ہو جاتے ہیں حالانکہ چند بدتمیز دوست، کچھ بے خبر رفیق اور ایسے بدنیت انسان بھی موجود ہیں جنہوں نے یہ سوال مجھ سے بھی بارہا کیا''۔

لیجیے موصوف کو خود سے پوچھے جانے والے سوال پر دوست بدتمیز اور انسان بدنیت نظر آنے لگے۔ کیا بات ہے صاحب۔ یہ تو انسان کے قلبی جذبات ہیں۔ عورت ہو یا مرد، عمر والا سوال تو سب کے لیے ہی تکلیف دہ ہے۔ کوئی یہ سوال نہیں سننا چاہتا اور سن بھی لے تو جواب نہیں دینا چاہتا۔

ایک اور تحریر دیکھیے 'شادی شدہ اور کنوارے' میں کیا خوب موازنہ کیا گیا ہے کنواروں اور شادی شداوں کا۔ اور پھر دونوں کی موافقت اور مخالفت میں بھرپور دلائل دے کر میزان قاری کے ہاتھ میں تھما دی گئی کہ خود ہی وزن کرے اور خود ہی فیصلہ۔

اس تحریر میں ''مشتاق یوسفی'' صاحب کے مزاج کی بھرپور چھاپ نظر آتی ہے۔ تازہ تازہ بنی خستہ نان خطائیوں جیسی۔ منہ میں رکھو اور گھل جائے۔ پتہ بھی نہ چلے اور ختم ہو جائے، انسان اور کی چاہ لیے بیٹھا رہے۔ معشوق لکھتا رہے اور قاری پڑھتا رہے۔

''بعض حضرات شادی کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے اور اسے برا سمجھ کر اس برائی کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو دو دو تین تین مرتبہ اس مہم کو سر کرتے ہیں۔''

''مرزا کہتے ہیں کہ آج کل جھوٹ کا چلن عام ہے کسی پر بھی بھروسہ

آسانی سے نہیں کرنا چاہیے اگر کوئی کہہ دے کہ زہر سے انسان مرجاتا ہے تو بھروسہ نہیں کرنا چاہیے خود کھا کر دیکھ لینا چاہیے۔''

''ایسے شخص پر کم سے کم ہمیں تو بھروسہ نہیں کہ جس کے منہ میں سگریٹ ہو اور وہ اس کی برائیاں بھی کر رہا ہو کہ اس سے صحت خراب ہوتی ہے۔''

''جہاں سائنس کی نظر نہیں جاتی وہاں بیوی اور ساس کی نظر جاتی ہے۔''

''مرزا کہتے ہیں کہ ہر کام کرنا چاہیے تاکہ تجربہ حاصل ہو بھلے ہی وہ شادی ہی کیوں نہ ہو۔''

''اچھا عاشق کنوارا ہوتا ہے اور ضروری نہیں کہ اچھا کنوارا اچھا شوہر بھی ثابت ہو۔ مرزا کہتے ہیں کہ کنوارے کو یہ آزادی ہے کہ وہ اپنی محبوباؤں کا ذکر کرسکتا ہے اور اس ذکر سے جان کو خطرہ نہیں ہوتا۔''

ایک اور کھٹی میٹھی تحریر ملاحظہ ہو:

''ادھار اور گالی''۔ کس خوبی سے ادھار دینے اور واپس نہ ملنے کے عمل کی انتہا کے تعلق کو آپس میں جوڑا گیا ہے اور کس طرح اس رشتے کو ظاہر کیا گیا ہے۔ انشائیے کا ابتدائیہ دیکھیے۔

''جتنا قریبی رشتہ میاں بیوی کا ہوتا ہے اتنا ہی گہرا رشتہ ادھار اور گالی کا ہے۔ جیسے شوہر بیوی کے بغیر ادھورا سا، نامکمل سا اور ناتمام سا لگتا ہے ویسے ہی ادھار کا ذکر ہو اور گالی نہ دی جائے یہ بھی کچھ ادھورا اور نامانوس سا لگتا ہے۔''

آگے بڑھتے ہیں مرزا اور معشوق کی مشترکہ تحقیق سے مستفید ہوتے ہیں۔ گالیوں کی اقسام اور موقع محل، بھلا گالی دیتے وقت کسی طرح کی احتیاط کیوں کر ممکن ہوسکتی ہے۔

''گالی دینا ایک کیفیت ہے جیسے ہی یہ کیفیت طاری ہوتی ہے گالی اپنے حق دار تک گولی کی سرعت سے پہنچ جاتی ہے۔''

''گالیاں بہت ساری اور قسم قسم کی دی جاتی ہیں لیکن دینے کا موقع و محل الگ الگ ہوتا ہے۔ کوئی غصے میں آکر دیتا ہے کوئی زندگی سے تنگ آکر،

کوئی حسد کر کے تو کوئی اس واسطہ دیتا ہے کہ فلاں شخص کا بھلا کیوں ہوا۔؟''

مرزا کے مطابق گویا صرف ادھار دینا ہی گالیوں کی وجہ پیدائش ہے نہ ادھار ہوگا نہ گالی وجود میں آئے گی اور یوں کائنات ایک پاکیزہ ماحول کی پرورش کر سکے گی۔

''مرزا کہتے ہیں کہ گالی سے معاشرے کو پاک کرنے کا ایک راستہ یہ بھی ہے کہ دوستوں کو ادھار دینا بند کیا جائے تا کہ بے ایمانی کا شبہ ہی نہ ہو اور گالی دینے کی نوبت ہی نہ آئے۔''

اگلا جملہ پڑھیئے اور مزے لیجیے۔

''دوست سے ادھار لینے کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ جب لوٹانے کا وقت آجائے تو فتنہ فساد کر کے آسانی سے انسان مکر سکتا ہے۔ایک بار انسان مکر جائے تو گالی خود بخود بیچ میں آکر اپنے ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔''

کرب و بلا کے اس دور میں جہاں ہر ذی نفس اپنے مسائل کا بوجھ اٹھائے دہرے عذاب میں مبتلا ہے ایسی ہشاش بشاش تحریریں وقت کی ضرورت ہیں۔

معشوق کی تحریروں میں جابجا مشتاق یوسفی کا انداز نظر آتا ہے، کسی ماہر بازی گر کی طرح جو پہلے کسی دکھتے مقام پر آنکس چھبوئے اور پھر درد کی شدت سے کلبلاتے وجود کو ٹھنڈے میٹھے جملوں کا شربت پیش کر دے اور پھر خود دور بیٹھ کر تماشا دیکھے۔

بالکل کسی معشوق فریبی کی طرح جو محبت کی طرف پیش قدمی بھی کرے اور محبت سے دامن بھی چھڑا لے۔

جیو معشوق بہت جیو۔

جب تک تم اور تمہارے جیسے لکھنے والے موجود ہیں تیز دھوپ کی سختی میں پرسکون جھونکے آتے رہیں گے اور دل سکون پاتے رہیں گے۔

شمع اختر انصاری

حیدر آباد پاکستان



سنگین کو رنگین کرنے والا انشائیہ نگار

لفظ بھی ذائقہ رکھتے ہیں اور خوراک کی طرح ان کے بھی انسان پہ اثرات ہوتے ہیں۔ اچھی خوراک جیسے مثبت اور ناقص منفی اثرات ڈالتی ہے بالکل ویسے ہی الفاظ کے اثرات جادوئی ہوتے ہیں۔ مزاح لکھنا اور پھر زندگی سے بھرپور مزاح لکھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ اکثر مزاح کے نام پہ ایسی چیزیں پڑھنے کو ملتی ہیں کہ ہنسنے کے بجائے رونے کا دل کرتا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی بہترین مزاح لکھ رہا ہے تو اس کی حیثیت اندھیرے میں جلتے چراغ کی سی ہوتی ہے۔ میں ایسے ہی ایک چراغ سے کچھ دن پہلے ولر اردو ادبی فورم کشمیر کے ذریعے روشناس ہوئی۔ نام ایس معشوق احمد ہے۔ ان کی چند تحریریں پڑھنے کے بعد میں ان کے فن کی معترف ہوگئی ہوں کیونکہ ان کی تحریرات کو پڑھ کر محسوس ہوا کہ موصوف نے مزاح کو معتبر رکھا ہے اور ہنسنے ہنسانے کی خاطر قلم کو آلودہ ہونے سے بچائے رکھا ہے۔ ان کی کچھ تحریریں جو میں نے پڑھیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

1 دوست، دشمن اور بیوی:-

یہ انشائیہ پڑھ کے مجھے لگا یہ تکون ہونا لازم ہے۔ پھر یاد آیا میں بیوی سے محروم ہی رہوں گی کیونکہ یہ سہولت صرف مردوں کو میسر ہے کہ ان کی بیوی ہوتی ہے۔ یقین جانیے ایک ہوک دل سے اٹھی۔ ان کے انشائیوں میں بات بات پہ بات مرزا صاحب کے کھاتے یوں ڈالی گئی ہے جیسے گھر کے سب سے چھوٹے فرد پہ کام ڈالا جاتا ہے یا رعب۔۔۔ لیکن مرزا صاحب کا کردار ایسا ہے جیسے پکے دوست کی صحبت بشرطیکہ کہ دوست ہو۔ بات سے بات

نکال کر اسے ایک دوسرے سے ایسی خوبصورتی سے جوڑا گیا کہ واقعی پڑھنے کا لطف دوبالا ہوا اور بے ساختہ مسکراہٹ امڈ آتی ہے۔ لکھتے ہیں:

''زندگی کے جلوے دوست اور بیوی سے ہیں اور زندگی پر حملے دشمن سے ہیں۔''

اس کو پڑھ کے آپ کو معلوم ہوگا کہ ایس معشوق احمد کا شمار خوش قسمت ترین لوگوں میں ہوتا ہے بلکہ میرے خیال سے تو ان کو اپنا آستانہ بنا لینا چاہیے جہاں لوگ ایسے نایاب انسان کی زیارت کرنے کو جائیں جو رشتے دار نامی دشمنوں سے محفوظ ہیں۔

اس انشائیے میں آپ کو کئی گر بھی ملیں گے جو زندگی میں نہایت کارآمد ہو سکتے ہیں جیسے کامیابی کا راز بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مرزا کہتے ہیں کہ بیوی کے طعنوں، دوستوں کے مشوروں اور دشمنوں کی کامیابی سے جل کر انسان میں وہ طاقت آجاتی ہے کہ یہ کسی بھی ناممکن اور محال کام کو سہل اور آسانی سے انجام دے سکتا ہے۔''

ان کے یہاں لفظوں کا جلترنگ ایسے بجتا ہے کہ پڑھتے ہوئے تحریر مترنم ہو جاتی ہے لکھتے ہیں:

''ہر شخص کی زندگی میں دوست کا سایہ، دشمن کی چھایا اور بیوی جیسی مایا ہوتی ہے''۔

''کچھ لوگ گوشہ نشین ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی پرسکون اس لیے ہوتی ہے کہ انہیں کسی دوست کا ساتھ، دشمن کی ذات اور بیوی کی بات کا تجربہ نہیں ہوتا''۔

لڑائی جھگڑے کی افادیت ہو یا دعا کے اصل کلمات آپ اس تحریر کو پڑھنے کے بعد وہ سب سیکھیں گے۔

2 **عمر پوچھنا** :-

ایک سنگین موضوع کو رنگین بنانا ایک بہترین مزاح نگار کی پہلی خوبی ہے۔ عمر

پوچھنا کے عنوان سے ہی آپ جان جائیں گے کیسا سنگین موضوع چنا گیا ہے لیکن اس کو رنگین کرنے کے لیے اشعار کے ساتھ ساتھ حساب کتاب اور رنگ برنگے شوشے چھوڑ کر مزین کیا گیا ہے۔ زبان کی بے ساختگی اور برجستگی ہی اس تحریر کو مزیدار بنا رہی ہے۔ عمر بتانے کے معاملے کو کیسے نمٹایا جائے اس کا حل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جب بھی مجھ سے کوئی عمر پوچھتا ہے تو میں سالوں کی بجائے دنوں میں بتاتا ہوں جیسے کہ میری عمر ''نو ہزار آٹھ سو ساٹھ دن'' ہیں عمر پوچھنے والے کے چہرے پر پریشانی اور پشیمانی کے آثار دیکھ کر میں سمجھ جاتا ہوں کہ میری طرح یہ بھی حساب میں کورا ہے''

3 اشعار کی من بھاتا شرح :-

اشعار سے لگاؤ انسان کے ادبی ہونے کی نشانی ہوتی ہے۔ اشعار کو سمجھنے والا ہی ان سے لطف اندوز ہوسکتا ہے لیکن جو انسان منفرد انداز سے سمجھتا ہے وہ نہ صرف خود لطف اندوز ہوتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی دل کھول کر ہنسنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ لیکن ایسی شرح لکھتے دھیان رکھیں کہ ان شعراء کا کلام لیں جو اس دار فانی سے کوچ کر چکے ہوں ورنہ نتائج کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔ یہ ایک پسندیدہ مشغلہ بھی ہوسکتا ہے۔ اس تحریر میں سر نے 2 اشعار میر تقی میر کے، 3 احمد فراز کے، 2 غالب اور اقبال سے ڈرتے ڈرتے ایک شعر ان کا بھی شامل کیا ہے۔ غم روزگار، غم پٹرول سے کچھ دیر کے لیے نجات کا بہترین ذریعہ ان اشعار کی شرح پڑھنا ہے۔ اگر آپ گنجے پن کی وجہ سے پریشان ہے یا بجلی کا بل زیادہ دیکھ لیا، آپ کے چینل کے سبسکرابرز زیادہ نہیں ہو رہے یا ہمسائی نے آپ کے جیسا جوڑا پہن لیا ہے ان سب غموں کو بھلانے کے لیے یہ تحریر پڑھیں اور بے ساختہ مسکرائیں۔

4 شادی شدہ اور کنوارے :-

روز ازل سے انسان اسی کشمکش کا شکار ہے کہ کون زیادہ خوش قسمت ہے شادی شدہ یا کنوارے۔ اس سوال کا جواب دینے کو بہت سی مثالوں کے ساتھ واضح کیا گیا ہے کہ کون فائدے میں ہے کون خسارے میں اور مثالیں بھی ایسی لاجواب ہیں کہ انسان عش عش

کرا ٹھے۔ اگر چہ پھر بھی انسان کسی نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا اور فیصلہ وقت کے ہاتھ پہ رکھ دیتا ہے پھر بھی چند پل حساب کتاب میں ضرور الجھتا ہے۔ یہ سچ ہے دور کے ڈھول سہانے اور یہ سہانے ڈھول جب گلے پڑتے ہیں تب چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ سولہ طبق روشن کرنا چاہتے ہیں تو یہ تحریر پڑھیں جس سے آپ کے گیان کو پرواز ملے گی۔

ایس معشوق احمد گیان بانٹتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کنوارا احمق، بے وقوف اور نا تجربہ کار ہوتا ہے''۔

اگر آپ سائنس کے طالب علم رہے ہیں تو دھماکہ خیز مواد کی تباہ کاریوں سے بخوبی واقف ہوں گے۔ لیکن جو راز معشوق نے فاش کیا ہے وہ انوکھا ہے۔ کہتے ہیں۔

''سائنس اور بیوی میں بڑی مماثلتیں ہیں''

یہ جملہ پڑھ کر آرٹس پڑھنے والے تو اپنے آپ کو ملامت کریں گے کہ اگر سائنس پڑھی ہوتی تو کچھ نہ کچھ تو بیوی کے بارے جانکاری ہوتی۔ لیکن آرٹس پڑھنے والوں کے لیے بھی خوشی کے بہت سے مواقع ہوتے ہیں کیونکہ انشائیہ نگار خود اس بات پہ کشمکش کا شکار ہیں کہ کون زیادہ خوش ہے۔ اس کا اعتراف وہ کچھ یوں کرتے ہیں:

''کوئی میزان ایسا نہیں بنا جو یہ تخمینہ لگا سکے کہ کنوارا خوش ہوتا ہے یا شادی شدہ''۔

5 ادھار اور گالی:-

گالی دینا ویسے تو نا مہذب عمل ہے لیکن دماغ کی نسوں کو پھٹنے سے بچانے کے لیے اکثر لوگ اس کا تبادلہ بے دھڑک کرتے ہیں۔ اس میں ادھار لینے والا اور دینے والا دونوں شامل ہوتے ہیں۔ اس تحریر میں آپ ادھار لینے والوں کی اقسام، ان کی عادات اور ان کے ڈھیٹ پن کے بارے میں معلومات سے استفادہ کریں گے۔ ادھار لینے والے کو گالی ایسے ہی ہوتی ہے جیسے کسی کے لیے گلاب کا پھول وہ بھی گملے کے بغیر کیونکہ گملے سمیت پھولوں کے اثرات اور نتائج اور طرح کے ہوتے ہیں۔ اس انشائیے میں مرزا صاحب نے معاشرے کو گالی سے پاک کرنے کی کیا خوب ترکیب بتائی ہے کہتے ہیں:

''گالی سے معاشرے کو پاک کرنے کا ایک راستہ یہ بھی ہے کہ دوستوں کو ادھار دینا بند کر دیا جائے''۔

اس دل خراش راز سے بھی پردہ اٹھاتے ہیں کہ کچھ گالیاں آپ کے نصیب کی نہیں ہوتیں بلکہ آپ انہیں خریدتے ہیں۔

''گویا یہ گالیاں آپ کے نصیب میں نہیں تھیں بلکہ آپ نے جان بوجھ کر دوست سے پیسوں کے عوض خریدی ہیں''۔

زندگی میں ہنسی اتنی ہی لازم ہے جتنی شوگر لو ہونے پر مٹھاس۔ پنکھے سے لٹکی لاش کو اتارتے سب یہی سوچتے ہیں جانے کون سی غلطی کی ہوگی جو کہ بس اتنی سی ہوتی ہے کہ ہم ہنسنے کی کوتاہی کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ میں ایس معشوق احمد کو مبارکباد پیش کرتی ہوں کہ ان کی کتاب ''کوتاہیاں'' منظر عام پر آ رہی ہے۔ انہوں نے اپنی ''کوتاہیوں'' کے سبب بہت سے لوگوں کو ہنسی سے منہ موڑ لینے کی کوتاہی سے بچانے کی عمدہ کاوش کی ہے۔ اللہ پاک ان کے قلم اور علم میں برکت عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

اقراء یونس

وزیر آباد پاکستان



عمر پوچھنا

دنیا میں بہت سارے سوالات ایسے ہیں جن کا کبھی صحیح جواب نہ آیا۔ مسئلہ کشمیر کا مستقبل میں کیا حل نکل آئے گا اور اس عورت سے جس کو سجنے سنورنے اور تا حیات جوان رہنے کا شوق ہو کی عمر پوچھنا جیسے سوالات اسی زمرے میں آتے ہیں۔ سب سے بڑی بے ادبی یہ ہے کہ کسی جوان اور خوبصورت عورت سے اس کی عمر پوچھنا۔ ہاں اگر سوال کرنے والا بھی خوبصورت ہو تب وہ برا نہیں مانتی۔ تب اس کا موقف ہوتا ہے کہ ــــ

ہونٹ اچھے ہوں تو سمجھ کہ سوال اچھا ہے

اور وہ پر رونق باتوں باتوں میں ایک دو سال گول کر کے اس سوال کا جواب دیتی ہے تا کہ سوال کرنے والے کو یقین اور اطمینان ہو جائے کہ ابھی نشیب نہیں آیا ہے جوبن کے بسنت رت کا۔

بعض شوخ اور چنچل لڑکیوں سے بات کرنے کو دل مچل جائے تو بات شروع کرنے کی غرض سے ان سے بھی یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آپ کی عمر کتنی ہے اور پھر یہ حالت ہو جاتی ہے کہ ــــ

سوال کر کے میں خود ہی بہت پشیمان ہوں
جواب دے کے مجھے اور شرمسار نہ کر

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ سوال جب کسی سیم تن، گل بدن سے کیا جاتا ہے تو وہ خاموش رہتی ہے۔ حیرانی اور پریشانی سے جب وہ سوال کرنے والے کو تکتی ہے تو سوال

کرنے والا فخر محسوس کرتا ہے کہ ـــــ

اس سے بہتر جواب کیا ہوگا
کھو گیا وہ میرے سوالوں میں

یہ حقیقت ہے کہ خوبصورت مرد ہو یا عورت اپنی خوبصورتی اور دلکشی کا اسے فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ بعض تو اپنی خوبصورتی سے بادشاہ وقت کے منظور نظر ہو جاتے ہیں لیکن بعض خوبصورت لوگوں کا ماضی بڑا بدصورت ہوتا ہے۔ جب ان سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آپ کی عمر کتنی ہے تو وہ ماضی کے جھرونکوں سے جھانک کر وہ اذیت ناک لمحے یاد کر لیتے ہیں جو انہوں نے بڑی کرب ناک اور اذیت سوز حالت میں گزارے ہوتے ہیں۔ آنکھوں میں اشک لیے اس سوال کا جواب وہ اتنا ہی دے پاتے ہیں کہ ـــــ

کوئی سوال نہ کر کوئی جواب نہ پوچھ
تو مجھ سے عہد گذشتہ کا حساب نہ پوچھ

اس سوال سے عورتوں کو ہی کوفت نہیں ہوتی بلکہ بعض مرد بھی اپنی صحیح عمر بتانے سے نہ صرف کتراتے ہیں بلکہ گھبراتے ہیں۔ بعض خوش اخلاق ایسے بھی ہیں جو اس سوال کو ہنسی میں ٹال دیتے ہیں اور بعض اس سوال پر تند مزاجی اور چڑچڑاہٹ کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ حقیقت مجھ پر کبھی واضح نہ ہوئی کہ لوگ اس سوال سے برہم کیوں ہو جاتے ہیں حالانکہ چند بدتمیز دوست، کچھ بے خبر رفیق اور ایسے بدنیت انسان بھی موجود ہیں جنہوں نے یہ سوال مجھ سے بھی بارہا کیا۔ مجھے مستورات کی طرح اپنی صحیح عمر بتانے میں اعتراض نہیں اور نہ ہی مجھے اس سوال سے کشش قلبی ہوتی ہے لیکن جب بھی مجھ سے کوئی عمر پوچھتا ہے تو میں سالوں کے بجائے دنوں میں بتاتا ہوں جیسے کہ میری عمر ''نو ہزار آٹھ سو ساٹھ دن'' ہیں۔ عمر پوچھنے والے کے چہرہ پر پریشانی اور پشیمانی کے آثار دیکھ کر میں سمجھ جاتا ہوں کہ میری طرح یہ بھی حساب میں کورا ہے۔ بچارا حیران اور حرماں واپس لوٹ جاتا ہے۔ اگلی ملاقات میں اس کی خوشی دیکھنے لائق ہوتی ہے جب وہ حساب کر کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ لیے سلام علیک کے بعد وہاں سے ہی بتاتا ہے کہ اچھا تو آپ کی عمر ستائیس سال ہیں۔

یوں تو سوال کرنا ہوشیار، ذہین اور خردمند ہونے کی دلیل ہے۔ انسان چونکہ سوچتا سمجھتا ہے، غور وفکر کرتا ہے اس لیے سوالات پوچھتا ہے، کبھی خود سے، کبھی اپنی ذات سے، تو کبھی کائنات اور دنیا کے معاملات سے۔ سوال دبی بغاوت اور شک وشبہات کا دوسرا نام ہے۔ یہ بغاوت کی چنگاری اور شک وشبہ میں مبتلا ہونے کا جنوں ہمیں قدیم عمارات اور ہزاروں لاکھوں سال پرانی چیزوں کو دیکھ کر نہیں ہوتا بلکہ اس وقت یہ شعلے بھڑک اٹھتے ہیں جب ہم کسی خوبصورت خاتون اور بدسیرت مرد کو دیکھتے ہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ خوبصورت خاتون اور بدمعاش مرد ایک جیسے ہوتے ہیں کہ دونوں میں یہ بات مشترکہ ہے کہ دونوں جلد بوڑھے نہیں ہوتے۔ دنیا میں اور بھی تو ہزاروں مسائل اور لاکھوں معاملات ہیں جن پر ہم نے لب نہ کھولیں اور سوالات نہ کیں لیکن جب ہماری نظر عورت پر پڑتی ہے تو فوراً دل مچل جاتا ہے اور ذہن بیدار ہو کر اس سے عمر پوچھنا کی ضد کرتا ہے۔ مشہور یہ ہے کہ عورتیں اپنی صحیح عمر کبھی نہیں بتاتی لیکن تجربہ یہ ہے کہ عورتیں ہی اپنی عمر نہیں چھپاتی بلکہ شاعر اور عمر رسیدہ شخص بھی کبھی اپنی صحیح عمر نہیں بتاتے۔ جب بھی کسی شاعر سے یہ سوال پوچھا گیا کہ آپ کی عمر کتنی ہے گول مول کر کے جواباً یہی کہتا کہ ـــــ

عمریں دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آزرو میں کٹے گئے دو انتظار میں

عمر رسیدہ شخص تو اس سے بھی آگے بڑھ کر اس سوال کا جواب دیتے ہیں، خاص کر وہ جو صحت منداور پیری میں بھی تندرست ہوں۔ پہلے تو وہ یادداشت کا بہانہ بنا کر اس سوال کو ٹال دیتے ہیں۔ جب سوال پوچھنے والا شک بھری نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس کو لگتا ہے کہ عمر نوح کے برابر اس کی عمر ہو سکتی ہے تو خود ہی دس بیس سال گھٹا کر خود کو تسلی دیتے ہیں کہ ـــ

ابھی تو میں جوان ہوں

ایسے بھی اس دنیا میں شاطر اور چالاک لوگ ہیں، جب ان سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آپ کی عمر کتنی ہے تو وہ یہ سوال کسی بزرگ کے حوالے بڑی چالاکی سے کرتے ہیں۔ ان کو بزرگ کی خراب یادداشت کا گمان نہیں بلکہ یقین ہوتا ہے۔ جب بزرگ کے منہ سے

ان کے متعلق یہ کلمہ خیر نکلتا ہے کہ ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے، ابھی تو یہ بچے ہیں تو وہ فرط جذبات اور خوشی سے بزرگ کو یہ کہتے سنے گئے کہ _ عمرت دراز باد فراموش گار من۔

کسی کی عمر پوچھنا برا نہیں۔ ہمیں پورا حق حاصل ہے کہ ہم اپنے قدیم اور یادگار چیزوں کے بارے میں دریافت کریں۔ قدیم عمارات ہوں، کھنڈارت ہوں یا عورتیں ان کی عمروں کو جاننے کے حقوق ہم نے محفوظ رکھے ہیں۔ عمارات اور کھنڈارت سے اس سوال کا جواب ممکن نہیں اس لیے یہ سوال عورتوں سے ہی کرنا مناسب لگتا ہے۔ ان سے یہ سوال کرنا کہ محترمہ تمہاری عمر کتنی ہے ہمارا محبوب قومی مشغلہ بن گیا ہے۔ ہاں ایسا سوال کرنا اس وقت نامناسب اور نازیبہ لگتا ہے جب کسی کی شادی ہونے والی ہو اور عین اسی وقت دلہے یا دلہن سے کوئی سوال کرلے کہ تمہاری عمر کتنی ہے۔ اپنی اصل عمر سے چند سال گھٹانے کے باوجود اس سوال سے شادی ہوتے ہوتے رہ جائے کہ دلہن یا دلہا بڑی عمر کا ہے تو بڑا دکھ اور قلق ان کے گھر والوں کو ہوتا ہے۔ دکھ شادی ٹوٹنے کا نہیں ہوتا بلکہ وہ سارے انتظامات ضائع ہونے اور خواب ادھورے رہنے کا ہوتا ہے جو انہوں نے شادی کے لیے دیکھے اور سوچے تھے۔ شادی سے قبل اگرچہ ہم جھوٹ بولنا اپنا فرض جانتے ہیں لیکن جب عین شادی کے وقت غلط عمر بتانے اور دس بارہ سال گھٹانے کے باوجود شادی ٹوٹ جائے تو بڑا صدمہ ہوتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ دکھ شادی کے ٹوٹنے کا نہیں ہوتا بلکہ پچھتاوا اس بات کا ہوتا ہے کہ ہزار جھوٹ بھی کسی کام نہ آئے۔

جھوٹ بولنا گناہ ہے لیکن یہ ثواب کے برابر تب ہو جاتا ہے جب اس کے سہارے سے چالیس سال کی عورت تیس کی ہو جاتی ہے اور پچاس سال کا مرد چالیس کا ہو جاتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ عمر چھپانی نہیں چاہیے کیونکہ چہرے سے عیاں ہوتا ہے کہ اب عمارت کو کھنڈر بننے میں اور کتنا وقت لگے گا۔ کوئی ایسا سوال نہیں کرنا چاہیے جس سے کسی کی دل آزاری ہو اور جواب دینے میں بے قراری محسوس ہو۔ کسی کے جذبات مجروح کرنا اور دل دکھانا گناہ ہے اور یہ جرم کی صورت تب اختیار کر جاتا ہے جب کسی سے عمر پوچھی جاتی ہے۔



خوشامد

خوبصورت بیوی کی چاہ، اچھا کھانا کھانے کی آرزو اور اپنی تعریفیں سننے کا شوق سب کو ہوتا ہے۔ انسان کو جو چیز بھاتی ہے اس کی وہ تعریفیں کرتا ہے۔ خالص تعریفیں انسان کو اتنا خوش نہیں کرتی جتنا جھوٹی تعریفیں سرور اور مسرت بخشتی ہیں۔ سچی تعریفوں سے تو کسی کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا البتہ خوشامد انسان کے لیے کامیابی کی وہ سیڑھیاں میسر رکھتی ہیں جن پر چڑھ کر انسان بڑے سے بڑے عہدے پر پہنچ سکتا ہے۔ محنت اور خوشامد سے کیا حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں محنت کے پاؤں آبلہ پا ہوتے ہیں اور انسان تھک ہار کر بیٹھ جاتا ہے وہاں سے خوشامد کی ابتداء ہوتی ہے اور انسان خوشامد سے اس منزل کو حاصل کرسکتا ہے جو اس سے کوسوں دور ہو۔ انسان نے اتنی ترقی کرلی ہے اور اتنا مہذب ہوا ہے کہ اب اس بھلے مانس کی بھوک صرف ایک روٹی سے مٹ جاتی ہے لیکن شخصیت بھوکی رہتی ہے۔ شخصیت کو نکھارنے، پرکشش، پرتاثیر بنانے اور اس کی بھوک مٹانے کے لیے تعریفوں کے دو بول ہی کافی ہیں اگرچہ وہ جھوٹے ہی کیوں نہ ہوں۔ کسی شخص کو خوش فہمی میں مبتلا کرنے کے لیے اتنا کہنا کافی ہے کہ آپ نہایت شریف، ملنسار، عمدہ گفتار، تمیزدار، حیادار اور پاک دامن ہیں۔ اگر اس میں وہ خوبیاں نہ بھی ہوں پھر بھی وہ آپ کی باتوں پر یقین محکم کر لے گا اور جان تک نچھاور کرنے کو تیار ہوجائے گا۔ جو کام ہفتوں میں بھی ہونا دشوار نظر آئے اگر وہ منٹوں میں کروانا ہو تو خوشامد سے کارگر طریقہ کوئی نہیں۔ اگلے زمانوں میں جب بے وقوف بادشاہ عاقل وزیر سے ناراض ہوتا تھا تو عاقل وزیر بے وقوف بادشاہ کو مبالغے اور خوشامد سے زیر کردیتا تھا نہ صرف بادشاہ کا غصہ رفع ہوتا تھا بلکہ بادشاہ انعام واکرام سے بھی دانا

وزیر کو نوازتا تھا۔خوشامد کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے یہ بڑی کارآمد تدبیر ہے۔اس سے بڑے بڑے شیر زیر ہوتے ہیں۔کہتے ہیں کہ چغل خور اور چغلی سے ڈرنا چاہیے کیونکہ جس طرح کسی کی خوشامد کر کے جنگ کرائی جاسکتی ہے اسی طرح کسی کی غمازی کر کے اسے رن کے میدان تک پہنچایا جاسکتا ہے۔خوشامد امن و امان کو قائم رکھنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔بادشاہوں کی خوشامد کر کے بعض عقل مند عدل و انصاف قائم کرتے تھے اور بچاری معصوم رعایا کا بھلا ہوتا تھا۔بعض دفعہ خوشامد خوش کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ماتحت اپنے آفیسر کی خوشامد نہ کرے تو آفیسر خوش کیسے ہوگا۔پہلے پہل جب لوگ خالص سچے تھے خوشامدی کو برا سمجھا جاتا تھا اور خوشامدی کا منہ کالا مشہور تھا۔جب سے زمانے نے کروٹ لی اور ہر چیز میں ملاوٹ ہونے لگی یہاں تک کہ خونی رشتوں اور انسان میں بھی، خوشامد میں ہی خوشی نظر آنے لگی اور خوشامد میں آمد ہے تیزی سے مقبول ہوگیا۔اس کو ہنر اور فن مانا گیا۔اب یہ عیب نہ رہا بلکہ یہ چالاکی، دانائی اور عاقل ہونے کی دلیل بنی۔اب خوشامد کو برا اور نقصان دہ نہ سمجھا گیا بلکہ منافع اور فائدے کی چیز مانا گیا جس سے تعلقات بڑھتے ہیں۔خوشامد کو وہ سیڑھی مانا گیا جو ایک دوسرے سے جان پہچان کراتی ہے۔

خوشامد کرنا آسان کام نہیں ہے۔اس کے لیے وسیع مطالعہ، بلند تخیل، زبان و بیان پر قدرت، تشبیہ کا گہرا علم اور استعارے کی پہچان ہونی چاہیے۔پرشکوہ الفاظ اور زبان کا چٹخارہ بھی ضروری ہے۔بہت احتیاط کی ضرورت پڑتی ہے ورنہ کام بگڑ جانے کے قوی امکانات ہوتے ہیں۔خوشامدی کو دوسروں کے مزاج کی خوب واقفیت ہونی چاہیے۔کون کم تعریفوں سے خوش ہوتا ہے اور کس کے لیے تعریفوں کے پل باندھنے پڑتے ہیں اس کا علم بہر طور ضروری ہے۔ لوگ مختلف کام نکالنے اور مختلف غرض سے خوشامد کرتے ہیں۔کوئی ظاہر داری کے لیے تو کچھ جان پہچان کے لیے اس کا سہارا لیتے ہیں۔کچھ لوگ دل لگی اور شوخی کے لیے خوشامد کرتے ہیں تو کچھ کو مجبوراً خوشامد کرنی پڑتی ہے۔جو اشخاص مجبوراً خوشامد کرتے ہیں ان میں سرفہرست شوہر ہے۔شوہر اگر بیوی کی روز اور ہنگامی بنیادوں پر خوشامد نہ کرے تو گھر کی صورتحال بگڑ سکتی ہے۔ ویسے بھی کہا جاتا ہے کہ وہ جھوٹ، جھوٹ نہیں ہوتا جس سے کسی کو فائدہ ہو۔اگر گھر کے افراد کو چند جھوٹی تعریفوں سے ذہنی سکون، قلبی راحت اور دلی تسکین ہوتی ہے تو خوشامد کرنا کوئی بری

بات نہیں۔ بیوی کے ہونٹوں کی تعریف، آنکھوں، بالوں اور خاص کر کہ ''آج تم قیامت لگ رہی ہو'' کہنا شوہر کے لیے بہت ضروری ہے۔ حالانکہ قیامت بڑی بھیانک، حواس باختہ کرنے والی، وحشت ناک اور ہیبت ناک ہوگی۔ پھر بھی یہ شوہر ہی ہے جو اتنا باہمت اور نڈر ہوتا ہے کہ بیوی کو قیامت کہہ ہی دیتا ہے اور وہ تعریفوں کی بھوکی پھولے نہیں سماتی اور یہ سن کر ہی اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ دوسرے نمبر پر مجبوراً خوشامد کرنے والوں میں شعراء حضرات ہیں جو کبھی خیالی محبوب تو کبھی گوشت پوست کی حقیقی محبوب کی خوشامد کرتے رہتے ہیں۔ شاعر نہ صرف محبوب کے ہونٹوں کو پنکھڑی کہہ دیتے ہیں بلکہ محبوب کو یہ تک باور کراتے ہیں کہ اے میرے محبوب تمہارے بدن کی تراش ایسی ہے کہ پھول اپنی قبائیں کترتے ہیں۔ بعض شعراء تو محبوب کی خوشامد کرنے میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ سرمئی آنکھوں سے لے کر سنہرے، گھنے اور ریشمی بالوں تک تعریفوں کے پل باندھتے ہیں۔ باتوں کی تعریفیں الگ۔ اتنا ہی نہیں بلکہ شعراء کی خوشامد کرنے کا طریقہ انوکھا، نرالہ اور دل کو چھو جاتا ہے۔ وہ اپنے زور تخیل اور ندرت انداز بیان سے خوشامد میں ایک لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ سننے والا ہی خوش نہیں ہوتا بلکہ پڑھنے والے کو بھی سرور آتا ہے۔ پرانے وقتوں میں بادشاہ اپنے دربار میں دو تین ایسے خوشامدی ضرور رکھتا تھا جو بادشاہ سلامت کی خوشامد اور مدح سرائی کرتے تھے۔ بادشاہ اپنی تعریفیں سن کر خوش ہو جاتے تھے اور انہیں خلقت سے نوازتے تھے۔

نوکر اور ماتحت ملازم کو اگر صاحب اور آقا کی خوشامد کرنی نہ آئے تو اس کے نصیب میں ڈانٹ ڈپٹ اور پھٹکار ہی آتی ہے۔ صاحب کو خوش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خوشامد کی جائے تاکہ صاحب خوش ہو کر دوسروں کو خوش رہنے دے ورنہ خواہ مخواہ ہی کام میں نقص نکل آتے ہیں۔ منو چپراسی بڑی میٹھی گفتگو کرتا تھا۔ وہ اپنے صاحب کو خوش کرنے کے ہنر سے خوب واقف تھا۔ جوں ہی اس کا صاحب دروازے کے قریب پہنچتا منو تعریفوں کے پھولوں سے صاحب کی اہلاً وسہلاً کرتا۔ صاحب منو سے ہمیشہ خوش رہتا تھا۔ منو کو وہ سارے مراعات ملتے تھے جو بڑے بڑے عہدوں پر فائز لوگوں کو میسر نہیں ہوتے تھے۔ خوشامد کی بدولت منو کی زندگی خوشگوار گزر رہی تھی۔

دنیا میں کون شخص ہوگا جو اپنی تعریفیں سن کر مسرور نہیں ہوتا۔ ہر وہ انسان جو معمولی سے معمولی کام انجام دیتا ہے اس کی نظر میں وہ عظیم کارنامہ ہوتا ہے جس کے لیے وہ خود کو تعریفوں کا حقدار سمجھتا ہے۔ جب اسے اس کا حق نہیں ملتا تو وہ رنجیدہ ہوتا ہے۔ اب جو بھی اس شخص سے تلطف سے پیش آتا ہے اور اس کی خوشامد کرتا ہے وہ جی جان سے اس پر نثار ہوتا ہے اور وہ صرف اور صرف خوشامدی کو ہی قابل اعتبار سمجھتا ہے۔ گھر سے لے کر ملکی سطح تک حالات کشیدہ ہے۔ ایک ملک کی دوسرے ملک سے دشمنی اور عداوت، عورت کی عورت سے جلن، بھائی بھائی کا دشمن غرض تعلقات خراب ہی نہیں بلکہ تشویشناک حد تک تباہ ہوئے ہیں۔ ان دشمنیوں، خراب تعلقات اور مراسم کو درست کرنے، مضبوط کرنے اور محکم کرنے کے لیے خوشامدیوں کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کرنا چاہیے تاکہ بگڑی صورتحال کو درست کرلیا جائے۔ جتنے بھی جھگڑے، فتنے، فساد ہیں ان کو اگر کوئی جڑ سے اکھاڑ سکتا ہے تو وہ خوشامدی ہے اور خوشامد سے ہی دل میں آئی دراڈ کو کم کیا جاسکتا ہے۔ مرد ہو یا عورت دونوں کا دل جیتنے اور اعتبار حاصل کرنے کے لیے خوشامد ضروری ہے۔ اسی سے بند دلوں کے تالے آسانی سے کھولے جاسکتے ہیں۔ زنگ آلودہ تالے کو کھولنے کی صرف ایک چابی ہے اور وہ ہے خوشامد۔ خوشامد کرتے وقت یہ دھیان رہے کہ خوشامدی ان عادات واطوار، رنگ ڈھنگ، سبھاؤ اور ان خوبیوں کا تذکرہ نہ کریں جو شخص مذکور میں موجود نہ ہوں اس سے ممدوح کو شک وشبہات گھیر سکتے ہیں اور اس پہ یہ واشگاف ہوسکتا ہے کہ آپ محض خوشامد کررہے ہیں جس سے بنا بنایا کام بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ خوشامد حد میں رہ کر کی جائے۔ ہاں اب اگر کسی کو خوشامد بری لگ رہی ہو اور وہ شخص واقعی سچی تعریفوں کے لائق ہو تو اس کی تعریف ہی کرنی چاہیے خوشامد نہیں۔ ایسے بہت کم ہی ہیں۔ زیادہ تعداد ان کی ہیں جو جھوٹ اور بس جھوٹ ہی کہتے اور سنتے ہیں۔ اگر ان کے سامنے کوئی سچ بولنے لگ جائے وہ اس کو اپنا دشمن تصور کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں جہاں سچ بولنے سے دشمن پیدا ہوتے ہیں وہیں جھوٹ سے دوستی اور خوشامد کرنے سے مضبوط رشتے بنتے ہیں۔ مضبوط رشتوں کو مضبوط تر کرنے کے لیے موجودہ دور میں خوشامد نہایت ضروری اور اہم ہتھیار ہے۔ ☆☆

دوست، دشمن اور بیوی

ہر شخص کی زندگی کو بنانے، سنوارنے اور بگاڑنے میں تین لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔
ان تینوں کے طفیل گرد و غبار میں اٹا شخص تختہ مینا تک پہنچ سکتا ہے اور ان ہی کی بدولت انسان طاوس آتش پر سے گر کر خاک میں راکھ کی مانند گھل مل سکتا ہے۔ ان تین ہستیوں میں دوستوں کی قربت، دشمنوں کی نفرت اور بیوی کی الفت شامل ہے۔ پروردگار کے حسین و جمیل تحفوں میں سے انسان کے لیے ایک تحفہ خاص نیک اور پاک سیرت دوست ہے۔ اس کی صحبت میں انسان نہ صرف نیک اور پارسا بن سکتا ہے بلکہ ان تمام لذتوں سے محروم ہو سکتا ہے جو گناہ میں پوشیدہ ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ نیک سیرت دوست کی صحبت میں بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ نہ صرف اچھے کاموں کی ترغیب دیتا ہے بلکہ عین جوانی میں برے کاموں سے روکنے کا فرمان بھی جاری کرتا ہے جو اس ظالم بادشاہ کے حکم سے کم نہیں جس نے بادشاہ بنتے ہی خوبصورت عورتوں کو دیکھنے سے منع کیا ہو۔

اس شخص پر خدا کا خاص کرم اور عنایت ہے جس کو ایسے دوست کی صحبت نصیب ہوئی جو واقعی بگڑا ہوا ہو۔ دوست بگڑا ہوا مل جائے تو ارمان ہی پورے نہیں ہوتے بلکہ ان سارے گناہوں سے نفرت ہو جاتی ہے اور انسان ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے جن کے جوانی میں ارمان اور بڑھاپے میں حسرت ہوتی ہے۔ دوستوں سے بے تکلفی ہوتی ہے اور یہ آزادی بھی کہ گندے سے گندا لطیفہ ان کو سنایا جا سکتا ہے اور وقت ضرورت ننگی سے ننگی گالی ان کو دی جا سکتی ہے۔ گویا اخلاق کو بگاڑنے، کردار کو خراب کرنے اور انسان کو رسوا کرنے کا

جورول ایک بے تکلف دوست نبھاتا ہے وہ کوئی جانی اور سنگین دشمن بھی ادا نہیں کر سکتا۔ انسان جس طرح دوستی بنا سوچے اور غیر ارادی طور پر کرتا ہے اسی طرح دشمنی پر بھی اس کا اختیار نہیں۔ وہ سچی اور کھری باتیں کر کے اپنے دشمنوں کی تعداد کو بڑھا سکتا ہے اور دوستوں کی تعداد کو گھٹا سکتا ہے۔ مستقبل میں سب سے زیادہ خطرناک دشمن وہ دوست ثابت ہو سکتا ہے جس سے ماضی میں قریبی دوستانہ مراسم رہے ہوں۔ آخر راز بھی کوئی سرمایہ ہوتا ہے اور راز جاننے والا اس اثاثے کو آرام سے لوٹ سکتا ہے۔ کمینے دوست سے وہ دشمن بہتر ہے جو صرف دشمنی کرتا ہے دوستی نہیں نبھاتا کہ دوستی کا دعوی کرنے اور بنیاد کھوکھلی کرنے کا کام دشمن نہیں کرتے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کم ظرف دوست سے بااصول دشمن اچھا ہے جو کھل کر دشمنی کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ آستین کے سانپ سے اس سانپ کا سر کچلنا آسان ہوتا ہے جو ڈسنے کے ارادے سے سامنے کھڑا ہو جائے۔ جس طرح زندگی کو پر رونق بنانے کے لیے دوست کا ساتھ اور ملاقات ضروری ہے اسی طرح چاک و چوبند اور ہوشیار رہنے کے لیے دشمنوں کی حاجت ہوتی ہے۔ دشمن نہ صرف آپ کے لیے کامیابی کا ضامن ہے بلکہ وہ آپ کو ان ناممکن کاموں کو کرنے کی سعی اور طاقت دیتا ہے جو بنا دشمن کے آپ سے ہو ہی نہیں سکتے۔ دوست اور دشمن کے بعد بیوی ہی وہ واحد مخلوق ہے جس کے سامنے بندہ نادم ہو کر اس کا خادم بن جاتا ہے۔ جانی دشمن سے خطرناک اگر کوئی مخلوق ہے تو اس کا نام عقل مندوں اور دانشوروں نے بیوی رکھا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ بیوی کے طعنوں، دوستوں کے مشوروں اور دشمنوں کی کامیابی سے جل کر انسان میں وہ طاقت آ جاتی ہے کہ وہ کسی بھی ناممکن اور محال کام کو سہل اور آسانی سے انجام دے سکتا ہے۔ ان تینوں کی بدولت ہی انسان وہ کام کر گزرتا ہے جس کی سکت اور کرنے کا حوصلہ اس میں پہلے نہ تھا۔ خدا بخشے مشتاق یوسفی نے لکھا ہے کہ دشمنوں کے حسب عداوت تین درجے ہیں۔ دشمن جانی دشمن اور رشتے دار۔ رشتہ داروں سے تو ہم تنگ نہیں، ہو سکتا ہے کہ یوسفی صاحب کو انہوں للچایا، بہلایا، پھسلایا اور ستایا ہو۔ ہاں جانی دشمنوں کی تفصیل دوست اور بیوی کے بغیر کچھ ادھوری سی نظر آ رہی ہے۔ ان دونوں کا شمار اس میں ہو جائے تو فہرست مکمل ہو جائے۔ مرزا کہتے ہیں کہ آدمی کو دوست

اور بیوی سے بچنے کی تدبیر کرنی چاہیے کیونکہ ان دونوں سے وہ بے خبر ہوتا ہے۔ اس نے اپنی ساری توجہ دشمن سے بچنے پر صرف کی ہوتی ہے۔

ہر شخص کی زندگی میں دوست کا سایہ، دشمن کی چھایا اور بیوی جیسی مایا ہوتی ہے۔ یہ نہ ہوں تو زندگی بے لطف اور خزاں رسیدہ سی لگتی ہے۔ ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے زندگی میں اس کا ساتھ نصیب ہو جس کا مکھ، دکھ سکھ میں اسے فرحت اور خوشی دے۔ کسی بھی انسان کی زندگی میں کچھ ہو نہ ہو بیوی ضروری ہوتی ہے۔ جو اسے ہر کام سے روکنے اور ہر بات پر ٹوکنے کی مجاز ہوتی ہے۔ شوہر کو مجازی خدا کہا جاتا ہے لیکن جب سے زمانے نے کروٹ لی اور دساتیر بدلنے لگے اور کچھ زبردستی بدلے گئے، اس کی حیثیت بھی وہ نہ رہی اور یہ خدا سے بندا اور بندے سے غلام بن کر ایسے سہما سہما اور ڈرا ڈرا رہنے لگا جیسے ہرن شیر کو دیکھ کر ڈر اور سہم جاتی ہے۔ جنگل میں شیر ہرن کو ڈراتا ہے لیکن یہاں ہرن نے اس شیر کو نہ صرف ڈرایا ہوا ہے بلکہ کبھی اس کا شکار کرتی ہے تو کبھی وہ سب آشکار کرتی ہے جو پردے خفا میں وفا کی چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ زندگی کی گاڑی تب ہی آگے بڑھتی ہے جب اس میں بیوی نام کا تیل ڈال دیا جائے ورنہ یہ گاڑی پریشانی کے دھکوں، الجھن کی رکاوٹوں اور انتشار کی اڑچن کا شکار ہو جاتی ہے اور اس طرح بند پڑتی ہے جیسے تھانے میں کوئی ضبط شدہ گاڑی ہچکیاں اور سسکیاں لے لے کر خستہ ہو جاتی ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ شباب کا دوست نیک سیرت نہیں ہوتا، دشمن خوبصورت نہیں ہوتا اور بیوی بدصورت نہیں ہوتی بشرطیکہ دوسرے کی ہو۔ خاندانی دشمن، جان نثار دوست اور قدرشناس بیوی نصیب والوں کی جھولی میں آتے ہیں۔

لڑائی جھگڑے سے زندگی کی رونق ہے۔ اس سے انسان کے ذہن کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے اور دل میں حسد کی آگ اور جلن کے شعلے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ پرسکون زندگی گزارنے کے لیے فتنہ فساد اور بحثا بحثی سے آشنائی ضروری ہے۔ یہ آشنائی اور شناسائی صرف تین لوگ کراتے ہیں، دوست، دشمن اور بیوی۔ یہ دل کا بوجھ ہلکا کرنے اور بلڈ پریشر کو بڑھانے کے آزمودے نسخے ہیں۔ ان کی موجودگی سے انسان کی وہی کیفیت ہوتی ہے جو پانی میں مگرمچھ کے سامنے، جنگل میں شیر کے سامنے اور اندھیرے کمرے میں سانپ بچھو کا سامنا ہونے

کے بعد ہوتی ہے۔ دشمن کا وجود ہی زندگی میں پریشانی کا سبب نہیں بنتا بلکہ دوست اور بیوی کا ہونا بھی انسانی سکون کے لیے مضر ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ دوست، دشمن اور بیوی تینوں کا ایک ہی کام ہے ذہنی سکون کو غارت کرنا۔ دوستوں کے طعنوں، دشمنوں کی حرکتوں اور بیوی کے مشوروں سے بڑا اثر ہوتا ہے۔ ان کے مشوروں اور حرکتوں سے سست ترین انسان بیدار اور صحت ور انسان بیمار ہوسکتا ہے۔

کچھ لوگ گوشہ نشین ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی پرسکون اس لیے ہوتی ہے کہ انہیں کسی دوست کا ساتھ، دشمن کی ذات اور بیوی کی بات کا تجربہ نہیں ہوتا۔ زندگی کے سرد و گرم سے آشنا شخص دنیا میں کوئی ایسا نہیں ہوگا جس کا ان تینوں سے واسطہ نہ رہا ہو۔ بعض کی زندگی ان کے وجود سے جنت کا نمونہ بنتی ہے اور بعض کی زندگی ان کی موجودگی سے جہنم سے بدتر ہو جاتی ہے۔ اچھا دوست اللہ کی خاص رحمت اور اچھی بیوی خاص عنایت ہے، دشمن کا درجہ زحمت کا ہی رہتا ہے چاہیے اچھا ہو یا بدتر۔ مرزا کہتے ہیں کہ دشمن کے بعد جانی دشمن صرف دو ہیں دوست اور بیوی۔ یہ دونوں دشمنی کرنے پر آجائے تو بڑے سے بڑے دشمن کا مرتبہ اس سے چھین لیتے ہیں۔

زندگی کے جلوے دوست اور بیوی سے ہیں اور زندگی پر حملے دشمن کی بدولت ہوتے ہیں۔ سچا پکا دوست جو دکھ سکھ میں کام آئے، با اصول دشمن اور بردبار بیوی کا وجود صرف قصوں کہانیوں میں ہی ہوتا ہے اصل زندگی میں ان ہی کا سامنا رہتا ہے جن کا سامنا ہم سب کو ہے۔ کسی بھی فرد کی زندگی میں صرف یہی تین لوگ انقلاب اور بدلاؤ لا سکتے ہیں۔ ان کے سوا نہ کسی کو حق ہے اور نہ ہمت کہ وہ انسان کو پریشان، متحرک، چاق و چوبند، درست اور چست حالت میں رکھ سکے۔ جہاں سانپ ڈسنا چھوڑ دیتا ہے وہاں سے دشمن ڈنک مارنے کی کوشش کرتا ہے۔ جہاں دشمن ناکام ہو جائے وہاں دوست خار چھبو کر اپنا حق دوستی ادا کرتا ہے اور جہاں دونوں ناکام ہو جائے وہاں بیوی ہی پھانس کھبو کر زندگی کو اجیرن بنانے کے لیے کافی ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ صبح شام خفیہ دشمن، منافق اور حاسد دوست اور پس قسمت بیوی سے نجات مانگی چاہیے۔ تینوں زندگی کو زہرناک، غضب ناک، کرب اور اذیت ناک بنا دیتے ہیں۔



کیا کرتے ہو؟

میری جب بھی کسی فرد سے ملاقات ہوتی ہے، اس کے بندوق سے پہلی گولی یہی نکلتی ہے کہ ''کیا کرتے ہو؟''۔

اس گولی سے سرکاری ملازم صاف بچ جاتے ہیں کہ ان کے پاس تنخواہ کی ڈھال ہوتی ہے جس کے پار یہ گولی نہیں جاتی لیکن ہم جیسے نکمے لوگ زخمی ہی نہیں بعض دفعہ شہید ہو جاتے ہیں۔ جواباً میں اگر کہوں کہ لکھتا ہوں تو دوسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ لکھنا تو شوق ہوا کام کیا کرتے ہو۔؟

صاحبو! شوق اور کام میں وہی فرق ہے جو بیوی اور محبوبہ میں۔ بھلے ہی آپ میدان عشق کے فاتح ہوں اور دو تین محبوب بھی رکھتے ہوں پھر بھی آپ سے سوال یہی پوچھا جائے گا کہ شادی شدہ ہو۔؟

سوال پر خاموشی اختیار کی جائے تو سوال پوچھنے والے کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ جواب دینا تو درکنار اس میں سوال کو سمجھنے کی صلاحیت تک موجود نہیں۔ میری خاموشی اس شخص کے لیے یہ جواب لے کر آتی ہے کہ میں فضول گو ہوں۔ وہ نصیحت آمیز لہجہ اختیار کرتا ہے اور دوسرا میزائل یہ داغ دیتا ہے کہ لکھنا وکھنا چھوڑو پہلے کچھ بنو۔!

پہلے کچھ بنو سن کر میں اتنا سنجیدہ ہو جاتا ہوں کہ جو میری طبیعت سے واقف نہیں انہیں یہی لگتا ہے کہ میں رنجیدہ ہو گیا ہوں۔ میں دور گگن کو تکنے لگتا ہوں اور دیکھنے والے جون کا شعر سوالیہ انداز میں پڑھتے ہیں کہ ___

یوں جو تکتا ہے آسمان کو تو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا

حضور کچھ بنے کی دھن میں مگن جب میں نے کامیاب کا گھوڑا ڈھونڈنا شروع کیا تو نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں ۔۔ ہزار جتن کے باوجود کچھ نہ بن سکا اور نکما ہی رہا تو گھر والوں کی کوششوں سے میری شادی ایسے ہوئی جیسے اچانک زلزلہ آتا ہے۔ میں پہلے ہی آوارہ گھوم رہا تھا اس میں اضافہ ہوا کہ اب میں جھومنے اور چکرانے بھی لگا اور میری چال ایسی ہوئی جیسے پہلی بار شراب پینے والا گرتے، سنبھلتے لڑکھڑاتے ہوئے چلتا ہے۔ دلہا بننے کے بعد بھی ان کے منہ تو بند نہ ہوئے جو یہ کہتے تھے کہ پہلے کچھ بنو اور ہنوز ان کے لب پر یہی صدا رہی کہ پہلے کچھ بنو۔ صاحبو! کچھ بنے کی لگن میں دلہا بنا یہ جواز ان کے لیے کافی نہیں کہ دلہا ہی سہی میں کچھ تو بنا۔ مرزا سے میں نے رابطہ کیا اور اپنی پریشانی بتائی۔

مرزا نے سنجیدگی اختیار کی اور یہ مشورہ دیا کہ نادان! کچھ بننا ہی ہے تو سرکاری نوکر یا جورو کا غلام بن۔ یہی دو ہیں جو خوش رہتے ہیں باقی سب سزا کا مزہ لے رہے ہیں۔

میں کچھ نہیں بن رہا اس وجہ سے بعض کو لگتا ہے میں کاہل ہوں۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان پر کسی حد تک یقین کیا جا سکتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ خالق نے ___

کاہلی سمیٹ کے سارے جہان کی
جب کچھ نہ بن سکا تو مجھے بنا دیا

نہیں نہیں خدا کی قسم میں کاہل نہیں۔ میں وہ جفاکش ہوں جو آدمی سے انسان بننے کی راہ کا مسافر ہوں۔ اگر ہر فرد یہ سوچ لیں کہ مجھے پہلے انسان بننا ہے بعد میں کچھ اور تو دنیا حسین سے رنگین ہو جائے گی۔ صاحبو! جیسے تیسے دلہا بنا، باپ بنا اور انسان بننے کی کوشش میں ہوں پھر بھی لب پر سوالات کہ پہلے کچھ بنو اور کیا کرتے ہو۔؟

اس کا کیا کیجیے کہ بعض لوگ میری شکل دیکھ کر مجھ سے ذاتی نوعیت کے سوالات کرتے ہیں جن پر میرا اختیار نہیں جیسے کہ اتنے کمزور کیوں ہو؟ اور عین شباب میں بال کیوں سفید ہوئے ہیں؟۔ پہلے سوال کے جواب میں عرض یوں ہے کہ پریشانیاں انسان کو کمزور کر

دیتی ہیں اور میں غم عشق کے ساتھ ساتھ غم روزگار کا بھی مریض ہوں۔صاحبو! میں سائنس اور طب کا ماہر نہیں یہی وجہ ہے کہ میں نہیں بتا سکتا کہ عین شباب میں بال کیوں سفید ہوتے ہیں۔جب بھی مجھ سے کوئی سوال کرتا ہے کہ تمہارے بال کیوں سفید ہوئے ہیں میں اپنا ایک ٹوٹا پھوٹا شعران کو سناتا ہوں کہ ____

یوں ہی نہیں میں بوڑھاپے کے رتن پہ سوار
کچھ کچھ فکر روزگار کا بھی قصور ہے

جس طرز اور لہجے میں، میں یہ شعران کے سامنے دہراتا ہوں وزن سے خارج شعرشاعری سے بھی خارج ہوجاتا ہے اور سننے والے کو اندازہ ہوجاتا ہے کہ میرے بال سفید کیوں ہوئے ہیں۔

بال سفید ہونا بوڑھاپے کی نشانی ہے اور عین ممکن ہے کہ بوڑھاپے کے نشانیاں عین جوانی میں ظاہر ہوجائیں۔بعض بزرگ جو ناخواندہ ہوتے ہیں کہا کرتے ہیں کہ بال سفید پریشانی سے ہوتے ہیں۔ان کا تجربہ بولتا ہے سچ ہی ہوگا کہ بال پریشانی سے سفید ہوتے ہوں گے۔انسان کو خوشیاں مل جائیں تو پھر دوبارہ یہ بال کالے کیوں نہیں ہوتے۔؟ پھر سے کالے ہوجائیں گے تو شاید لوگ طعنے دیں گے کہ بال بڑے ڈھیٹ اور بے شرم ہیں جلدی اپنا رنگ بدل لیتے ہیں۔

ان حسین دنوں کا ذکر ہے جب میں ہر محفل کی جان ہوا کرتا تھا۔جب سے منتظمین کو خبر ہوئی کہ میں سوائے لکھنے کے کسی کام کا نہیں تو انہوں نے مجھے محفلوں میں بلانا چھوڑ دیا۔میں نے بھی دنیا کی محفلوں سے اکتاہٹ کا اظہار کیا اور گوشہ نشین بلکہ اب پردہ نشین ہوگیا ہوں۔فقط اس لیے کہیں نظر نہیں آتا کہ لوگ پوچھ لیں گے کہ کیا کرتے ہو؟۔کسی پہ مرتا ہوں تو کیا کرتے ہو؟، کچھ نہ کروں تو کیا کرتے ہو؟۔اب تو حال یہ ہے کہ رسالے بھی اب میرا لکھا نہیں چھاپتے کہ میری جیب رسالہ خریدنے کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ غرض ادب میں بھی ان کی چلتی ہے جو صاحب زر اور دھن کے دھنی ہوں۔۔بے روزگار کا اس دنیا میں پروردگار کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔پچھلی دفعہ ایک محفل میں ایک اجنبی نے مجھ سے

سوال کیا کہ کیا کرتے ہو؟

میں نے جواباً کہا کہ میں انتظام کرتا ہوں۔اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور وہ تذبذب اور پریشان صورت میری طرف دیکھنے لگا۔مجھ سے کسی کی پریشانی اور غمگین شکل دیکھی نہیں جاتی۔میں نے وضاحت کی کہ صاحب میں پکانے کے لیے سبزی کا انتظام کرتا ہوں۔ یہ الگ بات کہ کبھی کبھار مہمان آجائے تو مرغ اور گوشت، پنیر اور کباب کا انتظام بھی مجھے ہی کرنا پڑتا ہے۔فقط یہی انتظامات میں نہیں دیکھتا بلکہ دوائی لانی ہو یا دودھ خریدنا ہو، بچوں کی پڑھائی ہو یا تن ڈھاپنے کے لیے کپڑا، غرض ہر ضرورت کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ اتنے انتظامات میں مصروف رہنے کے باوجود یہ سوال لوگوں کی زبانی سنتا ہوں کہ کیا کرتے ہو؟

صاحبو! انسان عمر بھر کچھ نہ کچھ اور کچھ کا کچھ کرتا رہتا ہے، کبھی اپنے لیے تو کبھی اپنوں کے لیے۔اس دوڑ دھوپ میں وہ اتنا مصروف ہوجاتا ہے کہ اسے اپنا آپ یاد نہیں رہتا۔اس کے باوجود کچھ اجنبی اور شناسا یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا کرتے ہو؟

راز دل فاش کیا کرتے ہو کیا کرتے ہو
نام سے میرے حیا کرتے ہو کیا کرتے ہو

یہ سوال کرنے والوں سے پوچھ لینا چاہیے کہ کیا کرتے ہو؟ بعض کام راز میں رہے تو بہتر ہے اور اگر وہ کام لوگوں کی نظر میں آجائے تو کام بدنام ہی نہیں ہوتے بلکہ افراد بھی بے آبرو ہوجاتے ہیں۔اس لیے کیا کرتے ہو؟ پوچھتے وقت احتیاط ضروری ہے۔ان سے ہی یہ سوال کرنا چاہیے جن کے کام سے سوال کرنے والا واقف ہو۔مرزا کہتے ہیں کہ کچھ سوالات خالق و مالک، فرشتے، بیوی کے علاوہ بس نوکری دینے والے افراد ہی کر سکتے ہیں جن میں کیا کیا ہے؟ کیا کرتے ہو؟ اور کیا کر سکتے ہو؟ شامل ہیں۔

تنگ آچکے ہیں ایسے سوالات سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم

صاحبو! کیا کرتے ہو؟ پوچھنے والے سے جواباً بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور بہت سے کام ہیں جو کئے جا سکتے ہیں جن میں کچھ اپنے لیے اور کچھ انسانیت کے لیے سودمند

ثابت ہو سکتے ہیں۔ جہاں تک پہلے کچھ بنو کا تعلق ہے تو آدمی کو کچھ نہ کچھ ضرور بننا چاہیے کیونکہ زمانہ ایسا ہے کہ لوگ خیریت بعد میں پوچھ لیتے ہیں پہلے حیثیت دریافت کرتے ہیں۔ اس پر آشوب دور میں آدمی انسان بن سکتا ہے، بوڑھے والدین کا سہارا بن سکتا ہے، غریبوں کا مسیحا بن سکتا ہے، درندہ صفت اور راکھشش بن سکتا ہے، چور ڈاکو لیڈر ابن سکتا ہے، کسی کا عاشق بن سکتا ہے۔۔۔۔غرض انسان کچھ بن بھی سکتا ہے اور بہت کچھ بنا بھی سکتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ آدمی کچھ بھی بن سکتا ہے۔ وہ الو سے دانشور، عاشق سے شوہر، فقیر سے امیر، نثری نظم نگار اور ناخواندہ ہونے کے باوجود صحافی بن سکتا ہے۔



بس چار دن

صاحبو! اردو شعراء کے نزدیک چار دن کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ بعض شعراء نے تو چار دن کو پوری زندگی سے تعبیر کیا ہے۔ فراق گورکھپوری نے اسی لیے کہا ہے کہ ___

یہ مانا زندگی ہے چار دن کی
بہت ہوتے ہیں یارو چار دن بھی

فیض صاحب کو یہ گلہ رہا کہ ___

اک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

انور شعور صاحب نے چار دن محبت میں گزارے لیکن ان چار دنوں کا اثر ان پر عمر بھر رہا۔ لکھتے ہیں کہ ___

محبت رہی چار دن زندگی میں
رہا چار دن کا اثر زندگی بھر

مختصر یہ کہ شعراء کرام نے چار دن کے حوالے سے جو خامہ فرسائی کی اسے حسب موقع مقرر استعمال میں لاتے ہیں اور قارئین یہ اشعار پڑھ کر حظ اٹھاتے ہیں۔ ان حضرات کے بعد ایک اور مخلوق ہے جو کام مکمل کرنے کے لیے بس چار دن کا وقت مانگتی ہے۔ اس مخلوق کو عرف عام میں ''پبلشر'' کہتے ہیں۔ خدا پبلک کو ان کے شر سے بچائے۔ مرزا کہتے ہیں کہ انسان کو جوانی میں تو دو ہی خوشی کے موقعے میسر آتے ہیں، دلہا بننا اور

صاحب کتاب ہونا۔دلہا ماں باپ کی کوششوں سے بنتا ہے اور صاحب کتاب اسے پبلشر بناتا ہے۔دلہا بننے کے لیے بچپن کی وادی سے نکل کر اسے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنا پڑتا ہے اور صاحب کتاب ہونے کے لیے پبلشر بس چار دن انتظار کراتا ہے۔صاحبو! ہم جب صاحب کتاب ہونے کا خواب دیکھ کر پبلشر کے پاس پہنچے تو اس نے اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے بس چار دن مانگے۔باقاعدہ اور باضابطہ اقرار نامہ لکھا گیا۔مجال ہے جو پبلشر نے ہمارا حق مارا ہو۔اس نے تو بڑے قرینے سے کتاب کے جملہ حقوق ہمارے نام محفوظ رکھے۔آج کل کتاب کوئی نہیں خرید رہا اس لیے پبلشر نے دل پر پتھر رکھ کر کتاب کی آمدن اپنے نام لکھوائی اور ساتھ ہی ہمارے دستخط اس اقرار نامے پر لیے جس پر لکھا تھا کہ بس چار دن میں یہ کتاب منظر عام پر آجائے گی۔چار دن یوں نکل جائیں گے اس احساس میں جی کر ہماری مسرت اور خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا اور اس ملاقات کے بعد ہم خواب دیکھنے لگے کہ ہماری کتاب کی رسم رونمائی کی تقریب منعقد ہو رہی ہے۔ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ ایوان صدارت میں معروف ناقدین بیٹھے ہوئے ہیں جن کے سامنے ہماری تعریفوں کے پل باندھے جا رہے ہیں۔ہمیں معتبر نقاد اور زبردست نثر نگار کے القاب دیئے جا رہے ہیں اور آخر میں ہم خوش ہو کر سب کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔مبصرین کرام نے ہماری کتاب پر بہترین تبصرے کئے اور وہ اس کتاب کو شہکار سے کم ماننے کو تیار ہی نہیں ہیں۔اگلے روز ہر اخبار کی زینت یہی خبر بنی ہے۔دوست احباب مبارک باد دے رہے ہیں اور گلی گلی نگر نگر بس ہمارے ہی چرچے ہیں لیکن یہ سب خواب تھا۔اصل حقیقت یہ ہے کہ کتاب چھاپنے کے لیے۔

پبلشر نے فقط مانگے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

آرزو تو یہ تھی کہ صاحب کتاب بن جاؤں لیکن پبلشر نے لمبا انتظار کرایا۔انتظار کی گھڑیاں گن گن کر گزارنے کے بعد ہماری سمجھ میں آگیا کہ چار دن کے معنی کیا ہیں۔چار دن گزر گئے اور ہم نے ایک ماہ کے بعد جب پبلشر سے رابطہ کیا تو سلام علیک کے بعد اس نے آخر پر اتنا ہی کہا کہ "بس چار دن میں کام ہو جائے گا"۔دو ماہ بعد پھر بات ہوئی تو پبلشر

نے بس چار دن کا ہی وقت مانگا۔ چھ ماہ بعد چار دن اور ایک سال بعد بھی اپنے زبان کا پاس رکھ کر اس نے بس چار دن ہی مانگے۔ ہمیں احساس ہو گیا کہ پبلشر زبان کا دھنی ہے۔ مجال ہے وہ اپنے قول سے مکر گیا ہو۔ پہلی ملاقات میں بھی چار دن مانگے تھے اور ایک سال بعد بھی بس چار دن اور ہی مانگ رہا ہے۔ ظفر اقبال شاید پبلشر سے ہی مخاطب تھے ؎

جھوٹ بولا ہے تو قائم بھی رہو اس پر ظفر
آدمی کو صاحب کردار ہونا چاہیئے

مجھے تو صاحب کردار بس پبلشر نظر آتا ہے جو اپنی بات پر قائم رہتا ہے۔ جو بات پہلے دن اس کی زبان مبارک سے نکلی، ایک سال بعد بھی اس پر قائم رہا اور سالوں بیت جائیں تو بھی وہی بات دہراتا ہے۔

میرے خیال میں پبلشر کا دوسرا نام لپاڑیا ہونا چاہیے۔ جھوٹ پبلشر کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی ہے وہ جب چاہیے اسے دوسروں کے کانوں تک آسانی سے پہنچا سکتا ہے۔ ہر شخص کو صبح دعا کرنی چاہیے کہ بے غیرت لیڈر، بے ضمیر ڈاکٹر اور کذب بیان پبلشر سے واسطہ نہ پڑے جائے۔ خدانا خواستہ ان سے واسطہ پڑ جائے تو انسان نہ زمین کا رہتا ہے نہ آسمان کا، بس جھوٹے وعدے، حقیر دلاسے اور جھوٹی باتیں سننے کا عادی بن جاتا ہے۔ پبلشر نے آج تک کسی شاعر یا ادیب کی سماعت تک سچ نہیں پہنچایا۔ جب پبلشر کی زبان مبارک سے سو قسمیں کھانے کے بعد نکل جائے کہ بس چار دن بعد آپ صاحب کتاب بن جائیں گے تو یقین کر لینا چاہیے دو تین سال میں یہ کارنامہ ضرور انجام پائے گا۔ یوں تو سیاسی رہنماؤں کے وعدوں کا بھروسہ نہیں کرنا چاہیے لیکن وہ بھی کبھی کبھار زبان کا پاس رکھ کر معجزہ انجام دیتے ہیں لیکن پبلشر کی زبان مبارک سے کبھی نہ سچی بات نکلتی ہے نہ وہ وعدہ جو پورا بھی ہو۔ مرزا کہتے ہیں کہ پبلشر وہ مخلوق ہے جو اپنے فائدے کے لیے جھوٹ بولنے اور بددیانتی کرنے کا ہنر لے کر پیدا ہوئی ہے۔

انسان ہو یا جانور، چرندوں، پرندوں کی بھی مختلف اقسام ہیں۔ دیکھا جائے تو موٹے طور پر پبلشروں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ کاروباری پبلشر اور خدمت گاری پبلشر۔

کاروباری پبلشر ہر کام میں سب سے پہلے اپنا فائدہ دیکھتا ہے اور ہمہ وقت روتا رہتا ہے کہ ''میں جو کتابیں چھاپ رہا ہوں اپنے خرچے سے چھاپ رہا ہوں۔ اس میں نفع تو نہیں البتہ میرا شوق ہے اس لیے میں ادب کی خدمت کر رہا ہوں''۔ یہ ہر ادبی محفل میں حاضر ہوگا اور مگر مچھ کے آنسو بہا کر اپنے کاروبار کو ساتویں آسمان تک پہنچانے کی سعی کر رہا ہوگا۔ اس کی ایک اور عادت ظاہر داری ہے کہ یہ سب کے سامنے متقی اور پرہیز گار ہونے کا دکھاوا کرے گا۔ اس کی زبان سے کبھی سچ نہیں نکلے گا۔ اس کا دوسرا نام جگاڑی ہونا چاہیے کہ یہ جگاڑ کر کے ہی اپنے کاروبار کو پھیلا رہا ہوتا ہے۔ دوسری قسم خدمت گاری پبلشر کی ہے۔ یہ خاموشی سے ادب کی خدمت کر رہا ہوگا اور بنا غرض کے اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہوگا۔ زبان و ادب کی جو خدمت ہو رہی ہے وہ ان کی بدولت ہے۔ اگر یہ نہ ہوتے تو بہترین کتابیں اور عمدہ رسالے ہمارے ہاتھوں میں نہیں ہوتے۔

آجکل بس چار دن مانگنے والے پبلشروں کی تعداد زیادہ ہے۔ مجھ سے جس پبلشر نے چار دن کا وقت مانگا تھا اب میں نے اس سے رابطہ کرنا یہ سوچ کر چھوڑ دیا ہے کہ جب اس کی زندگی کے چار دن ختم ہوں گے تو شاید میرا کام ہو جائے گا اور میری کتاب منظر عام پر آئے گی جس کا انتظار مجھے ہی نہیں میرے تمام دوستوں یہاں تک کہ اب دشمنوں کو بھی ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ پانچ سال کے بعد حکومت بدل جاتی ہے شاید پبلشر کے چار دن کی مدت بھی ختم ہو جائے۔ میں دعا کرتا ہوں اور ہو سکے تو آپ بھی دعا کیجیے کہ پبلشر کے چار دن مکمل ہو جائے اور پانچویں دن کا سورج طلوع ہو کر خوشیوں اور مسرتوں کا پیغام لے کر آئے۔ اس سے پہلے کہ میں آپ سے اجازت لوں عرض یوں ہے کہ میں بے ایمان اور وعدہ خلاف پبلشروں کی رسوائی کے لیے ایک کتاب ترتیب دے رہا ہوں۔ اگر آپ بھی پبلشر کے ستائے ہوئے ہیں تو مجھ سے بس چار دن میں رابطہ کر لیجیے۔ ہو سکتا کتاب کو ترتیب دے کر آپ کا کام بس چار دن میں ہو جائے۔۔



ادھار اور گالی

جتنا قریبی رشتہ میاں بیوی کا ہوتا ہے اتنا ہی گہرا رشتہ ادھار اور گالی کا ہے۔ جیسے شوہر بیوی کے بغیر ادھورا سا، نامکمل سا اور نا تمام سا لگتا ہے ویسے ہی ادھار کا ذکر ہو اور گالی نہ دی جائے یہ بھی کچھ ادھورا اور نامانوس سا لگتا ہے۔ ادھار مانگتے وقت لہجہ شیریں اور منہ میٹھا ہوتا ہے۔ قرض لوٹانے کا وقت آئے تو شرینی کڑواہٹ اور مٹھاس گالی میں بدل جاتی ہے۔ ادھار مانگنے سے دھن وان کی جو کیفیت ہوتی ہے اور جذبات جس شدت سے جوش مارتے ہیں اندازہ یہی ہوتا ہے کہ اب بے ساختہ اس کے منہ سے گالی ہی نکلے گی۔ جو ادھار لیتا ہے اس کو گالی پڑنی ہے اور جو دے دیتا ہے یہ پکی گارنٹی ہے کہ اس کی خاطر مدارت بھی گالیوں سے ہی ہوگی۔ گالی اس لیے ادھار کے ساتھ مضبوط رشتہ قائم کئے ہوئے ہے کیونکہ جس سے آپ ادھار لے رہے ہیں اس کا حق آپ کو چکانا نہیں اور جو آپ سے ادھار لے رہا ہے وہ آپ کو واپس لوٹائے گا نہیں۔ بندے کے پاس مال و متاع ہو تو ادھار کیوں لیں۔ کچھ انسان شوق مزاج ہوتے ہیں بہت سارے شوق پالتے ہیں۔ شوق برا نہیں اگر اس کی پرداخت جیب سے ہو۔ جیب سے باہر شوق ہو تو ساتھ گالیاں بھی ملتی ہیں۔ گالی خریدنے کا کسی کو تو شوق نہیں ہوتا ہاں اگر کسی کو یہ عجیب شوق ہے اور اس کو پال بھی رہا ہے تو گالیاں خریدنے کا آسان ترین نسخہ یہ ہے کہ آپ کسی عزیز دوست کو ادھار دے دیں۔ آپ کے ذہن میں یہ سوال گردش کر رہا ہوگا کہ بھلا کون پاگل انسان ہوگا جو گالیاں خریدے گا۔ خریدنے کی کیا ضرورت ہے لوگ تو مفت میں جہاں موقع ملے دہن مبارک کھول کر بے حساب دے دیتے ہیں۔

حضور قصور انسان کا نہیں حالات کا ہے جنہوں نے انسان کو پریشان کر رکھا ہے۔
جب انسان کا ذہن بھاری ہونے لگتا ہے تو وہ کسی نہ کسی کو گالیاں دے کر دردسر کو کم کرتا ہے۔ ویسے بھی اس دور میں ہر فرد کے گرد پریشانی نے ہالا بنا رکھا ہے۔ کوئی حالات سے پریشان ہے تو کسی کو گھریلو الجھنوں نے الجھا کے رکھا ہے۔ ذہن کو ہلکا کرنے اور الجھنوں کے گھیراؤ سے نکلنے کے لیے سیر و تفریح ہونی چاہیے تھی لیکن ہر فرد کو فون اور انٹرنیٹ نے چار دیواری کا قیدی بنا کے رکھا ہے اور انسان بھی اسی کا سہارا لیتا ہے تا کہ اسے ذہنی سکون میسر آئے۔ جوں ہی فون ہاتھ میں لیتا ہے اسے مختلف خبریں مزید پریشانیوں میں مبتلا کرتی ہیں۔ ناحق قتل، لوٹ مار، آگ کی واردات، چوری، ڈاکہ یہی سب تو روز سننے کو ملتا ہے۔ بندہ پریشان نہ ہو جائے تو کیا کرے۔ اوپر سے خراب حالات کا رونا الگ سے۔ خراب حالت میں مالی دشواری کا سامنا رہتا ہے۔ غم غلط کرنے کے لیے بس ایک تدبیر بچتی ہے کہ تنگ آمد بجنگ آمد بندہ دوسروں کو خوب گالیوں سے نوازتا ہے تا کہ اس کا سر ہلکا اور دماغ فراغت پائے۔
گالیاں بہت ساری اور قسم قسم کی دی جاتی ہیں لیکن دینے کا موقع و محل الگ الگ ہوتا ہے۔ کوئی غصے میں آکر دیتا ہے کوئی زندگی سے تنگ آکر، کوئی حسد کر کے تو کوئی اس واسطہ دیتا ہے کہ فلاں شخص کا بھلا کیوں ہوا۔؟ گالیاں دینا شروع کرتا ہے اور اس کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ کوئی ندامت یا پشیمانی کے آثار اس کے چہرے پہ نہیں ہوتے۔ گالیاں دینے کے بعد وہ خود کو ہلکا محسوس کرتا ہے اور اس کا چہرہ شریف دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے اس نے کوئی ملک فتح کر لیا ہو اور جیت کے جشن کے وقت جو تمازت چہرے پہ ہوتی ہے ویسی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس قسم کی جتنی بھی گالیاں ہیں، ان پہ آپ کا ہمارا کوئی بس نہیں ساری ذمہ داری دینے والے پہ عائد ہوتی ہے لیکن کچھ گالیوں کو ہم جان بوجھ کر خریدتے ہیں۔ کسی کی مدد کر کے یا دوستوں، رشتہ داروں کو ادھار دے کر۔ آپ درست فرما رہے ہیں کہ دوست وہی ہے جو مصیبت میں کام آئے، میں بھی اس کا قائل ہوں لیکن دوستی میں جہاں ادھاری حائل ہو جائے، زر درمیان میں آجائے، وہاں دوستی کا آنگن تقسیم ہو جاتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ گالی سے معاشرے کو پاک کرنے کا ایک راستہ یہ بھی ہے کہ دوستوں کو ادھار دینا بند کیا جائے تا کہ بے ایمانی کا

شبہ ہی نہ ہو اور گالی دینے کی نوبت ہی نہ آئے۔

مشہور ہے کہ جس شخص کے جتنے دوست ہوں گے وہ اتنی فراخی سے زندگی گزارتا ہے۔ اسے ادھار مانگنے میں دشواریاں نہیں ہوتیں۔ وہ کسی بھی دوست سے ادھاری مانگ لیتا ہے۔ ایک کے یہاں پھٹکاری ملے تو دوسرے، تیسرے دوست کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ لیکن بعض مختلف نظریہ رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دوست جتنے کم ہوں اتنی زندگی خوشگوار گزرتی ہے۔ آپ غلط مطلب نکال رہے ہیں۔ میں یہ ہرگز نہیں کہتا ہوں کہ آپ دوست نہ بنائیں "شغل بہتر ہے دوستی یاری کا" جتنے چاہے بنائیں لیکن احتیاط سے ورنہ آج ملاوٹ کس چیز میں نہیں۔ اس ملاوٹ نے ہر چیز کو ملیامیٹ کر دیا ہے، دوستی بھی اس سے پاک نہیں۔ خیر بات ہو رہی تھی گالیاں خریدنے کی کہ سستے داموں اور مفت میں گالیاں آپ کیسے خرید سکتے ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ آپ اپنے قریبی دوست کو ادھار دیجیے وہ آپ کے پیسے بھلے ہی نہ لوٹائے لیکن گالیاں ضرور دے گا۔ گویا یہ گالیاں آپ کے نصیب میں نہیں تھیں بلکہ آپ نے جان بوجھ کر دوست سے پیسوں کے عوض خرید لی ہیں۔ معاملہ یہاں پر ہی اختتام کو نہیں پہنچتا بلکہ آپ کا عزیز دوست بہت سارے خفیہ راز بھی افشا کرتا ہے۔ چونکہ آپ کا قریبی اور عزیز تر دوست رہ چکا ہوتا ہے اس لیے کما حقہ آپ کے عادات واطوار نیز طور طریقے سے واقف بھی ہوگا، اس لیے اس کو آپ کی تذلیل میں زیادہ دقت پیش نہیں آئے گی۔ وہ اگر آپ پہ چند ایک الزامات بھی لگا دیں جو کہ وہ لگاتا ہے اور لگانے میں کنجوسی نہیں کرتا، لوگ آنکھیں بند کر کے اس پہ یقین کر لیتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ آپ کے عزیز دوست نے آپ کے ساتھ شب و روز گزار کر راز و نیاز کی باتیں کی ہوتی ہیں اور لوگ اس راز سے واقف ہوتے ہیں کہ جو شخص جس کے جتنا قریب ہوگا وہ اس کی خوبیاں اور خامیوں کا اتنا ہی جانکار ہوگا اور وہ بنا کسی مشقت کے یقین کر لیتے ہیں کہ یہ دو سو فیصد سچ ہوگا۔ آپ قسمیں اٹھالیں خود کو پاک وصاف بیان کرنے کی، جتنے بھی جتن کریں سارے ناکام و نامراد۔ گویا نہ صرف دوست کھو دیا بلکہ ادھار دے کر اپنی عزت بھی کھو دی۔ اس لیے جتنا ہو سکے ادھاری سے بچنا چاہیے۔

میرا ایک دوست ہے جو ہر وقت ادھار کا کھانے اور ادھار لینے کا شوق رکھتا ہے۔ گاؤں کے ہر دوکاندار کے پاس اس کا کھاتہ ہوگا۔ وہ گالیاں کھانا اور دینا بھی جانتا ہے اس لیے ادھار لینے میں کامیاب ہوتا ہے۔ بڑا ڈھیٹ اور بے شرم ہے۔ اگر وہ بے شرمی کے اسرار و رموز سے واقف نہ ہوتا تو یقیناً شرم کے مارے چلو بھر پانی میں ڈوب کر مر گیا ہوتا۔ وہ جس سے بھی ادھار لیتا ہے واپس نہیں کرتا بلکہ گالیاں دیتا ہے۔ اسی لین دین میں کئی دفعہ نوبت ہاتھا پائی تک آن پہنچی اور وہ اس سے بھی گریز نہیں کرتا۔ کہتا ہے کہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے اگر ہاتھوں میں میل لگا ہو اور خجلی ہو رہی ہو اس کو دور کرنے کا واحد طریقہ مار پیٹ ہے۔ لوگ اس کو مارتے ہیں اس مار کے بدلے وہ ان کی ادھار لی ہوئی رقم کھا جاتا ہے۔ گاؤں شہر میں بدنام ہونے کے بعد اب وہ ان جگہوں کا رخ کرتا ہے جہاں اس کو کوئی نہیں جانتا۔ خیال رکھنا کئی آپ کے یہاں نہ آجائے بعد میں مت کہنا کہ میں نے ہوشیار رہنے کو نہیں کہا تھا۔

کاروبار کرنا ہو یا کوئی اور بڑا کام، شادی کرنی ہو یا گھر تعمیر کرنا ہو اس کے لیے بڑی اور معقول رقم درکار ہوتی ہے۔ جب بھی کثیر رقم کی ضرورت پڑتی ہے اس کو حاصل کرنے اور کام نکالنے کا طریقہ اور ذریعہ ادھار ہے۔ ادھار یا تو بینک دیتا ہے یا قریبی دوست۔ لوگ بینک سے ادھار کم ہی لیتے ہیں۔ اس کی معقول وجہ مرزا بیان کرتے ہیں کہ بینک کا ادھار جلد یا بدیر لوٹانا پڑتا ہے۔ ورنہ بینک والے زمین جائیداد پر قبضہ کر کے اپنی رقم نکال لیتے ہیں۔ زمین جائیداد پر قبضہ کرنا ان کا حق ہے لیکن نیلامی سے جو بدنامی ہوتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ دوسری صورت دوستوں سے قرض لینا ہے۔ دوست سے ادھار لینے کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ جب لوٹانے کا وقت آجائے تو فتنہ فساد کر کے آسانی سے انسان مکر سکتا ہے۔ ایک بار انسان مکر جائے تو گالی خود بخود بیچ میں آکر اپنے ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ دوستی تادیر قائم رکھنی ہو تو دوستوں کو چاہیے کہ وہ آپس میں ادھار دینے اور لینے سے پرہیز کرے اور گالی کا تبادلہ ہر دن کرتے رہے اس سے دوستی کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا ہے۔



بائیک خریدنے کا خواب

ایک عرصہ بعد مجھے احساس ہوا کہ اب مجھ میں پیدل چلنے کی ہمت نہیں ہے۔ یہ ہرگز نہیں سمجھنا کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔اس کے سوا اس احساس کے پیچھے دو محرکات ہیں۔ ایک یہ کہ میرے بغل سے کل کے لونڈے فرفر سے اپنی بائیک نکال لیتے ہیں۔اس کا مجھے گلہ نہیں لیکن جب سے صنف نازک نے اپنے نازک ہاتھوں میں بائیک کی پر خطر ہینڈل لی اور انہوں نے بھی کبھی میرے دائیں تو کبھی بائیں ہارن بجا بجا کر قیامت کا شور برپا کیا تو شدت سے یہ احساس زور پکڑنے لگا کہ میرے پاس بھی کم سے کم ایک عدد بائیک ہونی چاہیے کہ میں اکیسویں صدی کا وہ واحد فرد ہوں جو اتنی پر رونق سڑک پر پیدل چل رہا ہے۔ دوسرا بڑا محرک دوستوں کے طعنے بنے جو اپنے اسکوٹروں پر جب بھی میرے قریب سے گزرتے ہیں تو زور سے ہارن بجاتے ہیں اور مجھ پر آوازیں کستے ہیں۔صاحبو! مرزا کہتے ہیں کہ دشمن کی گالی اتنا اثر نہیں کرتی جتنا دوست کا چڑانا طبیعت میں چڑچڑاہٹ پیدا کرتا ہے۔ان دونوں محرکات نے مجھے مجبور ہی نہیں بلکہ لاچار کیا کہ میں ایک عدد اسکوٹر یا اسکوٹی خرید ہی لوں۔خریدنے کے لیے رقم کی ضرورت تھی وہ میرے جیب سے اسی طرح غائب تھی جیسے آج کے دور میں نیک لوگ نایاب ہیں۔اب میں بینک سے قرضہ لے کر اپنی تمنا پوری کر لیتا لیکن مرزا کہتے ہیں کہ میاں بینک کا لون اور کینسر کی بیماری ایک جیسی ہے کہ آدمی کو کھنگال کر کے چھوڑتی ہے۔اس لیے مناسب جانا کہ کوئی سیکنڈ ہینڈ بائیک ہی خرید لوں تا کہ آنے جانے میں سہولت اور طعنوں سے فراغت ملے۔

اس تیز رفتار دنیا میں جب بھی میں گھر سے نکلتا ہوں تو شام سے پہلے واپس نہیں لوٹ پاتا۔ ایسا ہرگز نہیں کہ بہت دور جاتا ہوں اور اس لیے ایسا ہوتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے ہماری آدھی زندگی ڈرائیور حضرات نے سواری اٹھانے اور اتارنے میں ضائع کردی ہے۔ کہیں جانے کی جلدی ہو تو پیدل چلنا بھی مناسب نہیں اور نہ ہی ڈرائیور حضرات کو رب نے سلیقہ دیا ہے کہ وہ دوسروں کی مجبوری اور جلدی کو سمجھ پاتے۔ اپنا قیمتی وقت بچانے اور سفر کو آسانی سے طے کرنے کے لیے یاروں دوستوں سے ایک ماہ تک مفید مشورے لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے اسی طرح بائیک خریدنے کی ضرورت ہے جیسے کسی شدید زخمی مریض کو خون کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ وہ زندہ رہ سکے۔ ہر روز میں مصمم ارادہ کرتا تھا کہ آج میں ضرور بائیک خریدلوں گا لیکن مزدور شہزادی کا خواب دیکھ لے تو آنکھ کھلتی ہی وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ مسئلہ صرف خریدنے کا نہیں تھا بلکہ اس سے بڑا مسئلہ یہ درپیش تھا کہ مجھے سائیکل کے سوا کچھ بھی چلانا نہیں آتا۔ بائیک چلانے کے لیے دل نہیں بلکہ فولادی گردے چاہیے جو میرے پاس نہیں ہیں۔ ایک دوبار بائیک چلانے کی کوشش کی تھی لیکن مکھی بھی سڑک پر چلتی تو میرا دل ایسے ڈھڑکنا شروع کرتا جیسے ہزاروں کے مجموعے میں پہلی بار تقریر کرنے والے شخص کا دل قابو میں نہیں رہتا۔ ایسا ہرگز نہیں کہ مجھے سکھانے والے دوست میسر نہیں جو ہمہ وقت میرے کان میں چلا کر بولتے رہتے ہیں کہ تو دنیا کا واحد شخص ہے جو کبھی بائیک نہیں چلاسکتا۔ 'تو' کا استعمال وہ اس کرخت لہجے اور بدتمیزی سے کرتے ہیں کہ مجھے نہ صرف سیکھنے سے نفرت ہوئی بلکہ دوستی کا لفظ بھی داغدار لگنے لگا۔ مرزا کہتے ہیں کہ آج کل دوستی مطلب کی اینٹوں سے بنی ہے۔ ایک ایک مطلب سے ایک ایک اینٹ گرجاتی ہے اور آخر کار دیوار کی حالت یہ ہوجاتی ہے کہ کہنا پڑتا ہے کہ لوگوں نے مرے صحن سے راستہ بنالیا۔

صاحبو! ایک روز دل پر پتھر رکھ کر میں حوصلوں کے پہاڑ پر چڑھا اور اسکوٹی پر سوار ہوکر خریدنے کے واسطہ ایک بائیک دیکھنے گیا۔ اطلاعاً عرض ہے کہ اسکوٹی میں ہی چلارہا تھا اور بچا بچا کر اتنی تیز رفتار سے چلارہا تھا جتنی تیز رفتار کچھوے کی ہوتی ہے۔ ایک دوست بھی ساتھ تھا۔ جب ہم منزل مقصود پر پہنچے جہاں وہ معتبر بائیک دیکھنی مقصود تھی تو جانے کیوں

ایک صدی پیچھے جانے کا من کیا۔ اگر ایک صدی قبل اس بائیک کو دیکھنے آتے جب یہ جوان اور نئی تھی تو یقیناً دل کو مول لیتی لیکن آج یہ ماضی کی شاندار عمارت کھنڈر بن چکی تھی۔ اس کا ہینڈل ایک طرف اس طرح جاتا تھا جیسے کبڑے انسان کے کندھے کا وزن ایک ہی طرف جاتا ہے۔ میٹر بکس خراب ہی نہیں بلکہ موجود ہی نہیں تھا۔ عین ممکن ہے کہ اگر غور سے وہاں دیکھا جائے تو ضرور کسی پرندے کا گونسلہ نظر آئے، اسٹینڈ ٹوٹا ہوا، انجن لیک کر رہا تھا اور تیل ایسے دھیرے دھیرے گر رہا تھا جیسے مریض کو گلکوز لگی ہو، جگہ جگہ زخم زدہ تھی، گرتے گرتے اب تھک چکی تھی اور فریاد کر رہی تھی کہ خدارا مجھے اب اور تکلیف نہ دو۔ اس کے ٹائر البتہ قدرے بہتر تھے اور ابھی چلنے کے قابل۔ جس شخص نے یہ بائیک دکھائی وہ اس کی ایسے تعریف کر رہا تھا جیسے نئی محبوبہ کی تعریف دوستوں کے سامنے کی جاتی ہے۔ کبھی اس کو گھوڑا کہتا تھا تو کبھی جہاز۔ صاحبو! یہ تو ہم نے بھی دیکھا کہ یہ بائیک چلتی تھی اور واقعی گھوڑا کہنے کی مستحق کہ یہ وہ گھوڑا تھی جو اب ضعیف ہو چکا تھا اور چلنا تو دور اب گھاس کھانے اور کھڑا رہنے کے لیے بھی اسے سہارے کی ضرورت پڑے۔ بائیک کی قیمت دس ہزار تھی اور امید ہے کہ آج سے پچاس سال بعد بھی اس کی یہی قیمت ہوگی کہ اس کا مالک اتنا ایماندار اور زبان کا پکا ہے کہ اسے یہ گوارا نہیں کہ وہ اس کی یہ قیمت تبدیل کرے اور زبان پر قائم نہ رہے۔ اپنی ناتوانی اور بائیک کی جوانی پر ترس کھا کر ہم بنا اسے خریدے واپس آئے۔ دوست نے بے شک مفید مشورے دئے کہ اسے ہی خرید لو کہ پیسہ بھی بچ جائے گا اور سیکھ بھی جاؤ گے لیکن خدا گواہ ہے کہ ہم نے مشورے پر عمل نہ کیا۔ اگر خرید لی ہوتی تو مجھے محکمہ آثار قدیمہ سے رابطے میں رہنا پڑتا جو اس نمونے کی اچھی قیمت ادا کرتے۔ اس نقصان کی تلافی نہیں ہوگی جو میرا ہوا۔ اس بائیک کی بدولت محکمہ آثار قدیمہ سے رشتہ بھی قائم ہوتا اور میرا نام بھی سنہرے حروف میں لکھا جاتا کہ اس قدیم بائیک کی کھوج فلاں شخص نے کی ہے۔

آپ یہ ہرگز نہیں سمجھنا کہ ایسی نایاب بائیک دیکھنے کے بعد مزید کچھ دیکھنے کی چاہ نہ ہوئی۔ اس عجوبے کو دیکھنے کے بعد ایسے ایسے ترم خان جھوٹوں سے واسطہ پڑا جو خرید فروخت کا کاروبار کرتے ہیں اور آٹھ کی چیز ساٹھ میں فروخت کرنے میں ماہر ہیں۔ خدا نے

ان سے بچایا ورنہ ان سے خود کو بچانا اتنا ہی محال ہے جتنا بھوکے شیر سے۔بعض دفعہ جیب کی تنگی بھی باعث رحمت ہے کہ انسان فضولیات سے ہی نہیں بچتا بلکہ قناعت پسند، صابر اور شاکر بھی بن جاتا ہے۔شوق قابو میں رہتا ہے ورنہ بعض شوق ایسے بھی ہیں جو بدنامی کا سبب بنتے ہیں۔ہمیں ایسے شوق تو نہیں جو شوق مزاجوں کو ہوتے ہیں۔مرزا کہتے ہیں کہ تخلیق کار کو صاحب کتاب، کنوارے کو دلہا بننے کا اور پیدل چلنے والے کو گاڑی خریدنے کا شوق ہوتا ہے۔ ہماری جیب یہ اجازت نہیں دیتی کہ گاڑی خرید سکے اور دوستوں کی نیند حرام کرنے کے لیے انہیں رات کو فون پر یہ اطلاع دے کہ کمینوں مجھے صبح فلاں جگہ سیر سپاٹے کے واسطے اپنی گاڑی میں جانا ہے۔''اپنی گاڑی'' پر اتنا زور دینا ہے کہ واقعی ایک رات نہیں دو تین راتوں تک وہ نیند کی دیوی کے دیدار سے محروم رہے۔گاڑی خریدنے کا خواب تو ادھورا رہا اب جو شوق بائیک خریدنے کا پال رہا ہوں وہ پودا تناور درخت کب ہوگا کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ابھی پچھلے دنوں ایک دوست نے فون پر یہ خوشخبری سنائی کہ پیٹرول کے دام بڑھ گئے ہیں۔اب تم جیسے پتلی جیب والے لوگ بائیک اور گاڑیاں بیچ دیں گے کہ وہ سونے کے دام پیٹرول نہیں خرید سکتے۔اس لیے جو خالی جیب ہیں وہ اپنی گاڑیاں اور بائیک سستے داموں بیچ دیں گے۔ اسی خوشی میں چند ایسے بائیک بیچنے والوں سے ملاقات ہوئی جو بیچنا بھی چاہتے تھے اور رکھنا بھی چاہتے تھے۔مرزا سے مشورہ کیا تو انہوں نے جواباً کہا کہ استعمال شدہ بائیک خریدنا ایسا ہی ہے جیسے برف کی لکڑیاں بنا کر آگ جلانے کی کوشش کرنا، دھوپ میں چھتری خریدنا اور سردی میں تربوزہ کھانا۔میری مانو تو نئی خرید لو۔لفظ خریدنا سن کر میری حالت ویسے ہی ہو جاتی ہے جو شدید سردی میں شلوار قمیض پہنے والے بندہ کی ہوتی ہے۔انسان کو خواب دیکھنے چاہیے تاکہ بعد میں انہیں پورے کرنے کی کوشش کرسکے۔میں نے بھی حوصلہ کرکے بائیک خریدنے کا خواب دیکھ لیا ہے۔دعا کیجیے کہ جلد پورا ہو جائے۔مرزا کہتے ہیں کہ بعض خواب جنبش لب کے منتظر ہوتے ہیں ہونٹ ہل جائے، ہاتھ کھڑے ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ خواب پورے ہو جائیں گے۔میرا بائیک خریدنے کا خواب جوں ہی پورا ہوگا میں آپ کی دعاؤں کے لیے آپ کا شکریہ ادا کروں گا تب تک دعا کرتے رہے۔☆☆

''کتے میں تیرا خون پی جاؤں گا''

میں شعلے دیکھ رہا تھا۔ارے نہیں صاحب نہ کہیں آگ لگی ہے اور نہ دھوان اٹھ رہا ہے۔آپ پریشان نہ ہوجائیں، سب خیریت ہے۔ یہ ایک فلم ہے پندرہ اگست 1975ء میں پردے پر آئی اور کئی سال تک اس نے سنیما پر راج کیا۔اپنے دور کی بڑی سپر ہٹ فلم تھی۔اس فلم میں کام کرنے والے جے، ویرو، ٹھاکر، گبر، سرما بھوپالی، انگریزوں کے زمانے کے جیلر بڑے مشہور ہوئیں۔جی ہاں جے، ویرو، ٹھاکر، گبر یہ سب اسی کے کردار ہیں۔یہ نام سن کر آپ نے انہیں پہچان لیا۔مطلب میری مشکل آسان ہوئی آپ نے یہ فلم دیکھی ہے۔ چلو اچھا ہی ہوا۔پھر تو آپ کو اس کا ایک مشہور ڈیئلاگ یاد ہوگا جو ویرو کی زبان سے نکلا ہے۔ ارے ہاں وہی ''کتے میں تیرا خون پی جاؤں گا''۔یہ ڈیئلاگ سن کر میں اس فلم کے ڈائریکٹر رمیش پسی صاحب سے یہ گزارش کرنے کی سوچ رہا تھا کہ حضور اگر ہیرو کو اتنی ہی پیاس لگی ہے اور وہ سنجیدہ ہے تو مہربانی کر کے اسے ہماری گلی بھیج دیجیے۔یہاں اسے ٹب بھر بھر کر کتوں کا خون ملے گا۔وہ پیے یا نہائے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ہاں اتنا ضرور ہے کہ بچے بوڑھے عورتیں مرد سب اس کو مفت میں دعائیں دیں گے۔ہمارے ہاں بھینس اور کتے کی جسامت میں زیادہ تفاوت نہیں ہے۔وہ بچاری تو فقط گھاس پر گزارہ کرتی ہے لیکن یہ کم بخت قصائی کا گوشت۔۔۔۔پھر سے آپ پریشان ہوئے میں وضاحت کرتا ہوں آپ پریشان نہ ہوں۔قصائی جس جانور کو ذبح کرتا ہے اس جانور کا گوشت کھاتے ہیں، بچے بوڑھوں کی ٹانگیں، بھولے بھٹکے سے اگر کوئی گائے بھیڑ، بچھڑا اس طرف سیر کو آ نکلے ان کو بھی کھا جاتے

ہیں۔ پتا نہیں انہوں نے اب انسانوں کو بھی کیوں کھانا شروع کیا ورنہ انسان کی پریشانیاں کیا کم تھیں۔ انسان نما کتے اگر چہ انسان کا مال، زمین، جائیداد کھاتے ہیں لیکن گوشت نہیں کھاتے۔ یہ زمین جائیداد کے لالچی تو نہیں ہاں ٹانگ دیکھ کر ضرور للچاتے ہیں۔ یہ تازہ موٹے سفید، کالے، پیلے بھورے رنگ کے کتے اتنے بے باک ہیں کہ کسی پر بھی حملہ آور ہو جاتے ہیں لیکن اتنی تمیز انہیں ہیں کہ یہاں سے سنتری جا رہا ہے یا منتری۔ سنتری پر حملہ کرنے کا حوصلہ تو کرتے ہیں لیکن منتری کو دیکھ کر دم دبا کر بھاگ جاتے ہیں۔ شاید یہ خوفناک کتے منتری سے ڈرتے ہوں۔ آخر اس دیس میں رہ کر انہیں یہ احساس تو ہو ہی گیا ہے کہ کون کیا کر سکتا ہے اور کس سے ڈرنا چاہیے اور کس کو دبوچنا چاہیے۔

فیض نے جنہیں گلیوں کے آوارہ اور بے کار کتے قرار دیا تھا، جو ذوق گدائی میں مست تھے اور جن کا سرمایہ زمانے کی پھٹکار تھی، جو نہ آرام شب کو کرتے تھے اور نہ انہیں دن کو راحت نصیب تھی، جن کا غلاظت میں گھر اور نالیوں میں بسیرا تھا ہماری گلی میں وہ کتے نہیں ہے۔ ابھی پچھلے ہفتہ کا ذکر ہے۔ جی ہاں آپ نے اخبار میں پڑھا ہوگا۔ اب تو سوائے بوڑھوں اور ادیبوں کے کوئی اخبار نہیں پڑھتا۔ بوڑھے عادت سے مجبور ہیں اور ادیب خوشی، مسرت اور دوسروں کو دکھانے کے لیے اخبار پڑھتے ہیں کہ حضور ہمارا افسانہ، غزل اس اخبار میں آئی ہے۔ ایک لائن مین کا ان کتوں نے بڑی بے رحمی سے چہرہ نوچ لیا۔ یہ خبر لرزا طاری کرنے والی تھی اور گلی گلی قریہ قریہ لوگوں کی زبان پر تھی۔ ایک بڑی جماعت مرزا کے آس پاس بیٹھی تھی اور وہ بڑے سنجیدگی سے بول رہے تھے کہ باقی کی ٹانگیں اور لائن مین کا چہرہ اس لیے کھایا کہ کتے بڑے گیانی ہیں۔ انہیں پتا ہے جب کوئی انسان گناہ کرنے جاتا ہے تو ٹانگوں سے چل کر جاتا ہے اسی لیے یہ گناہ گاروں کی ٹانگیں کھاتے ہیں۔ لائن مین کا چہرہ انہوں اس لیے نوچ ڈالا کہ وہ رشوت خور تھا، حرام کی کمائی کھاتا تھا جس سے اس کا چہرہ بے نور اور مسخ شدہ ہو گیا تھا۔ ان کتوں کو ان کا چہرہ پسند نہیں آیا اس لئے اسے نوچ ڈالا۔ مرزا کا یقین کیا جائے تو پھر گناہ گار خلقت کو ان کتوں سے ڈرنا چاہیے کہ یہ کسی کو بھی سزا دے سکتے ہیں۔

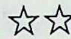
یہ عقل مند کتے ہیں، بے باک ہو کر بھی کچھ لوگوں سے خوف کھاتے ہیں۔ جی

ہاں آپ نے صحیح اندازہ لگایا یہ پولیس والوں کو دیکھ کر خوفزدہ ہوتے ہیں۔ نہیں صاحب یہ غلط فہمی ہے کہ یہ بندوق سے ڈرتے ہیں، نہیں نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ بندوق والوں کو دیکھ کر اتنا بھونکتے ہیں کہ بھونکنے کے سوا کوئی اور آواز سنائی ہی نہیں دیتی چاہیے باہر گولیاں چل رہی ہوں یا بم پھٹ رہے ہوں۔ یہ پولیس والوں کی خصلت اور فطرت سے ڈر رہے ہیں۔ پتا نہیں انہوں نے کہاں سن رکھا ہے کہ پولیس والے کی نہ دوستی اچھی اور نہ دشمنی۔ صاحب یہ عقل مند کتے اس پر عمل کرر ہے ہیں اور نہ دوستی ہی کرتے ہیں نہ دشمنی۔ دوسری مخلوق جس سے یہ بہت خوف زدہ ہیں وہ چور ہیں۔ انہیں یہ احساس ہے کہ جورات کی تاریکی میں یہ ہمت کرتے ہیں کہ کسی کا قفل توڑ لیتے ہیں، کسی کے گھر میں گھس کر الماری کو پھاڑ ڈالتے ہیں وہ بھونکنے والی بے زبان مخلوق کے ساتھ کیا کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ چور نڈر مخلوق ہے۔ ان کو نہ پکڑے جانے کا ڈر ہوتا ہے اور نہ رسوائی کا۔ شاید یہی وجہ ہوگی کہ یہ کتے اس مخلوق سے ڈرتے ہیں۔

جسامت کے لحاظ سے کتوں کی کئی قسمیں ہیں۔ موٹے، تازے، تنگڑے، کمزور، لاغر، لنگڑے۔ آپ نے دن میں کتوں کی ان اقسام کو گھومتے پھیرتے دیکھ لیا ہوگا لیکن راتوں کو یہ کتے بے قابو ہو جاتے ہیں۔ نہ صرف انسانوں کو خوف زدہ کرتے ہیں بلکہ انہیں تکالیف سے بھی دو چار کرتے ہیں۔ سردی ہو یا گرمی رات کا کوئی بھی پہر ہو یہ کتے کسی بھی آنگن میں گھس کر توڑ پھوڑ کرتے ہیں۔ انہیں کسی کا ڈر نہیں، یہ بادشاہ ہیں۔ انسان بھی کم ظالم نہیں ہے۔ ان بے زبانوں کو اگر غذا نہیں دے سکتا تو مارے بھی نہ۔۔ بعض لوگ کتوں کو پتھر مار کر زخمی کرتے ہیں۔ ان بچاروں کو اذیت میں مبتلا کرتے ہیں انہیں ایذا دینا کہاں جائز ہے۔ یہ مظلوم اگر سر اٹھائے جو دھیرے دھیرے اٹھانا انہوں نے سیکھ لیا ہے تو انسان واقعی سرکشی بھول جائے گا۔ حق تو یہ ہے کہ انسان واقعی سرکش ہو گیا ہے اور اسے وہ آسانی سے نہیں بھولے گا۔

سنا ہے کہ یہ کتے کسی بے گناہ کو نہیں چھیڑتے۔ خواہ مخواہ بچے ان سے خوف کھاتے ہیں اور بڑے احتیاط برتتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ بھونکنے کی آواز

سے ہی انسان کے حواس باختہ ہوتے ہیں۔ان کی تعداد بھی زیادہ ہے اور قد کاٹھ بھی وحشت ناک اور بقول مرزا بڑا خطرہ یہ ہے کہ یہ کتے لوگوں کو کھاتے ہیں لیکن افسوس لوگ انہیں کھا نہیں پاتے۔جب میں نے شعلے فلم دیکھی اور یہ ڈیلاگ سنا ''کتے میں تیرا خون پی جاؤں گا'' تو تشفی ہوئی۔خیال آیا کیوں نہ ویرو کو دعوت دی جائے۔اگر وہ ایسے نہیں آیا تو کچھ خرچہ پانی دے کر معاملہ طے کرتے ہیں تا کہ وہ ان کتوں کا خون پی جائے جو ہماری گلی میں نڈر اور بے خوف گھوم رہے ہیں، بھونک رہے ہیں، جینا دوبھر کر رہے ہیں تا کہ ہم بھی سکون کی نیند اور بے خوف گھر سے نکلنے کے لطف سے آشنا ہو جائے۔



لڑائی

ہم نے سوچا نہ تھا کہ ہر کام کرنے کا اپنا ایک سلیقہ اور طریقہ ہوتا ہے۔ ہمیں یہی لگتا تھا کہ کھانا، رونا، ہنسا اور لڑنا سب کو آتا ہے۔ کیا خبر تھی کہ جن چیزوں کو ہم معمولی سمجھتے ہیں وہ کتنی بھیانک، ڈراونی اور خوفناک ہوسکتی ہیں۔ کھانا پینا تو خوف ناک نہیں ہاں البتہ رونا، ہنسا اور لڑائی خوف ناک ضرور ہے۔ انسان روتا تب ہی ہے جب دکھ اور تکلیف زیادہ ہوں۔ ہاں اگر رونے سے کوئی اپنا آپ غموں سے ہلکا کر رہا ہے تو اسے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ اپنی بہتری کا سوچ رہا ہے اور اپنی بہتری سوچنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ انسان ہنستا تب ہے جب وہ کنوارہ ہو، دوستوں کی محفل میں ہو یا خوش ہو۔ بہت زیادہ تب ہنستا ہے جب شادی شدہ ہو اور قریب قریب نیم پاگل ہوگیا ہو۔ انسان لڑائی کب کرتا ہے اس کی کوئی حد مقرر ہے نہ جگہ اور نہ وقت۔ صبح سے شام تک، شام سے رات تک اور رات سے پھر صبح تک کوئی بھی وقت ایسا آسکتا ہے جب اس کی لڑائی کسی نہ کسی فرد سے ہوسکتی ہے۔ فرد اور بیوی موجود نہ ہوں تو انسان جذباتی ہوکر خود سے بھی لڑ سکتا ہے۔

دنیا میں پہلی لڑائی کس نے لڑی اور کب کب کن کن اشخاص کے درمیان لڑائیاں ہوئیں اس کا مجھے علم نہیں۔ یہ جانا ہو تو تاریخ کا مطالعہ کیجیے یہ یقیناً تاریخ میں درج ہوگا۔ مجھے یہ خبر ہے کہ لڑائی کی بنیادی وجہ اختلاف ہے اور اختلافات سوچنے اور غور وفکر کرنے سے ہوتے ہیں۔ لڑائی یا عقل مند کرتے ہیں یا بے وقوف۔ عقل مند کے پاس لڑنے کی معقول وجہ ہوتی ہے اور بے وقوف بنا وجہ اور بغیر مفاد کے میدان کارزار میں اترتا ہے۔ لڑائی کرنے

کے لیے بہادر اور صحت مند ہونا لازم نہیں بلکہ داؤ پیچ سے واقف ہونا ضروری ہے۔ جب بھی دو اشخاص کے درمیان لڑائی ہوتی ہے تو کسی نہ کسی کو فائدہ ضرور ہوتا ہے اگر ان دونوں کو پہلے ہی یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص کو ہمارے لڑنے سے فائدہ ہو رہا ہے تو یہ عمر بھر عزیز دوست بن کر رہیں گے اور لڑائی کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔

جس طرح سرکاری نوکری حاصل کرنے کے لیے پڑھا لکھا ہونے کی ضرورت نہیں صرف پیٹھ پیچھے کسی سفارشی کا ہاتھ ہونا ضروری ہے اسی طرح لڑائی کرنے کے لیے پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں۔ لڑائی چھوٹا بڑا، کمزور بہادر، بوڑھا جوان، مرد عورت، لڑکا لڑکی غرض ہر وہ شخص کرتا ہے جو جذبات پر قابو اور غصے پر اختیار نہ رکھتا ہو۔ پہلے لڑائی صرف اختلاف اور مطلب کے لیے کی جاتی تھی اب بغیر مطلب کی لڑائیاں بھی ہوتی ہیں۔ لڑائی کے لیے ضروری تھا کہ دو لوگ جو ایک دوسرے کو جانتے تھے اور آمنے سامنے ہوتے تھے وہی لڑائی کرنے کے اہل ہوتے۔ اب دور دراز اور سات سمندر پار لوگ بھی زبانی اور مکالماتی لڑائی کرتے ہیں۔ پہلے صرف زبانی اور ہاتھا پائی والی لڑائی ہوتی تھی اب زبانی لڑائی کے علاوہ نظریاتی اور خیالاتی لڑائی بھی ہوتی ہے۔ لڑائی رشتے داروں سے، بیوی سے، ہمسائے سے، ہمسائے ملک سے، اپنوں سے، غیروں سے ہر اس شخص سے ہوتی اور ہو سکتی ہے جس کو آپ جانتے ہوں۔ انجان اور غیر سے لڑائی کرنے کی نوبت کم ہی آتی ہے۔ اگر نوبت آئے بھی تو خطرناک اور خوفناک لڑائی صرف اپنوں سے ہو سکتی ہے غیر اور انجان لوگوں سے اختلاف اور نوک جھوک ہی رہتی ہے۔ دو اشخاص یا دو ملک دشمن ہو جائے تو لڑائی کا خطرہ کم رہتا ہے اور صلح کی تدبیریں زیادہ کی جاتی ہیں۔ جہاں کوئی توجہ نہیں دیتا اصل لڑائیاں وہیں لڑی جاتی ہیں۔ لڑائی کا خطرہ ہر جگہ لگا رہتا ہے۔ معمولی بات پر اختلاف ہو جائے تو تیز کلامی شروع ہوتی ہے۔ تیز کلامی کو اگر بروقت نہ روکا گیا تو گالی گلوچ کی نوبت آن پہنچتی ہے۔ گالی گلوچ پر قابو نہ پایا گیا تو ایک دوسرے کے گریبانوں تک ہاتھ پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں بھی اگر ہاتھوں کو نہ روکا گیا تو مار پیٹ شروع ہو جاتی ہے اور منہ، ناک، سر، آنکھ پر گھونسوں کے نشانات اور آثار دکھائی دیتے ہیں۔ پانی دو کناروں کے اندر ہی بہتا رہے تو شانتی رہتی ہے۔ جوں ہی

پانی کنارے پھاند کر باہر نکل آتا ہے تو سیلاب آتا ہے اور افراتفری پھیل جاتی ہے۔لوگ اپنے بچاؤ کی تدبیریں کرتے ہیں ٹھیک اسی طرح زبان اور جذبات پر جب تک قابو رہے تب تک سب ٹھیک چل رہا ہوتا ہے جوں ہی زبان تہذیب کے حدود اور جذبات اپنی قیود سے باہر ہوتے ہیں تو گھمسان کا رن ہوتا ہے جس میں سوائے نقصان اور بدنامی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔زر، زمین اور زن کے لیے لڑائی لڑنا تو قدیم زمانے کی ریت ہے۔زن کی وجہ سے ہابیل قابیل میں اختلاف ہوا اور نوبت قتل تک آن پہنچی۔قلوہ پطرہ سے لے کر پدماوتی تک زن کے لیے بہت ساری لڑائیاں ہوئیں۔ملک فتح کرنے کا مسئلہ ہو یا دل فتح کرنے کا جب تک میدان میں خون نہ بہایا جائے چلتا ہی نہیں ہے۔

لڑائی کی بہت ساری قسمیں موقع و مناسبت کے لحاظ سے ہیں۔موٹی طور پر لڑائی کی تین قسمیں ہیں۔گھریلو لڑائیاں، آس پڑوس سے لڑائیاں، ریاستی یا ملکی لڑائیاں۔

گھریلو لڑائیاں:- گھریلو لڑائی ساس بہو کی مشہور ہے۔معمولی معمولی باتوں پہ ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔یہ نہ صرف خود کو ذہنی مرض میں مبتلا کرتی ہیں بلکہ پورے گھر کو اور بعض دفعہ محلے کو دہکتا جہنم بنا دیتی ہیں۔ہر وقت شور اور ہمہ وقت نوک جھونک۔جس گھر میں ساس بہو میں جھگڑا نہیں ہوتا وہ واقعی جنت کا نمونہ ہوگا اور اس گھر کے افراد کی زبان پر ہر وقت شکر اور ان کے سر سجدے میں ہونے چاہیے۔ذہنی سکون بڑی چیز ہے یہ میسر نہ ہو تو انسان زندہ ہوتے ہوئے بھی در گور ہی ہوتا ہے۔گھریلو لڑائیاں بھائی بھائی اور کبھی کبھار بیٹے باپ میں بھی ہوتی ہیں۔گھریلو لڑائی میں میاں بیوی کی لڑائی لڑائی نہیں بلکہ مون سون کی وہ برسات سمجھی جاتی ہے جس کا بھروسہ نہیں ہوتا۔ابھی بارش ہوئی اور پلک جھپکتے ہی دھوپ۔لیکن کبھی کبھار یہ لڑائی اتنی دوریاں اور دراڑیں پیدا کرتی ہیں جو صرف طلاق سے ہی بھری جا سکتی ہیں۔بھائی، بھائی میں اکثر لڑائی جھگڑے شادی کے بعد ہوتے ہیں۔گمان کیا جا سکتا ہے کہ ایک دوسرے سے صلح اور سکون کے ساتھ بیس پچیس سال رہنے سے شاید اب یہ بھائی چارے سے تنگ آ گئے ہوں گے اس لیے اب باقی زندگی لڑائی جھگڑوں میں گزارنے کے خواہشمند ہیں۔چچا سے لڑائی عام طور پر جائیداد

کی غلط تقسیم پر ہوتی ہے۔ جوان کی نظروں میں تو غلط ہوتی ہے لیکن اصل میں درست تقسیم ہوتی ہے۔ گھریلو لڑائی کے پیچھے گھریلو پریشانیاں، گھریلو اختلافات اور گھریلو رشتے ہوتے ہیں۔ یہ لڑائیاں بعض دفعہ اتنا خطرناک روپ دھارن کر لیتی ہیں کہ انسان مختلف ذہنی اور جسمانی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ جینے کی رمق ہی ختم ہو جاتی ہے۔

پڑوسیوں سے لڑائیاں:- پہلے وقتوں میں پڑوسی ہونا رحمت مانا جاتا تھا آج پڑوسی ہونا کسی زحمت سے کم نہیں۔ اب تو یہ نوبت آن پہنچی ہے کہ دیواریں اتنی اونچی کی جاتی ہیں تا کہ پڑوسی دوسرے پڑوسی کے شر سے محفوظ رہ سکے۔ پڑوسی سے لڑائی وقتاً فوقتاً مختلف وجوہات کے سبب ہوتی ہے۔ کبھی بچے وجہ بنتے ہیں تو کبھی زمین۔ ایسا بھی اکثر ہوتا ہے کہ آنگن کے درخت کا سایہ ان بن کا سبب بنتا ہے یا وہ بارش کا پانی جو ایک ہمسائے کے آنگن سے گزر کر خود اپنا راستہ بناتے ہوئے دوسرے آنگن تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر بات اختلاف سے شروع ہو کر تلخ کلامی تک پہنچ جاتی ہے اور سال بھر یہ تو تو میں میں کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوتی۔ کھیل کھیل میں اگر بچوں میں سے کسی ایک کے بچے کو ہلکی سی چوٹ آجائے یا وہ جھوٹ موٹ کا رونا ہی شروع کر دے تو مہابھارت شروع ہو جاتی ہے۔ ایک ہمسایہ دوسرے کے تمام عیب مع خاندان سمیت ایک ایک کر کے گنتا ہے۔ عورتوں میں لڑائی تو زبانی جنگ تک ہی محدود رہتی ہے لیکن اگر کبھی اس میدان میں مرد کود پڑے تو یقیناً کسی نہ کسی کا ماتھا پھوٹ کر ہی شانتی ہوتی ہے۔

ریاستی یا ملکی لڑائیاں:- پہلے پہل دو ریاستوں یا ملکوں کے درمیان لڑائی کا سبب بادشاہ کی عاشق مزاجی اور حسن پرستی بنتی تھی۔ اب وہ عاشق مزاج اور جی جان سے فدا ہونے والے بادشاہ ہی نہ رہے جو کسی حسین و جمیل گل بدن کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد اس کو حاصل کرنے کے لیے پورے ملک پر چڑھائی کرتے تھے۔ اب وہ عاشق بادشاہ مر کھپ گئے۔ اب تو اعلیٰ اقتدار میں بیٹھے لوگ اپنے فائدہ کے لیے لڑائیاں لڑتے ہیں۔ ہاں اگر پڑوس میں کمزور ملک ہو تو طاقتور ملک اس پر ایسے جھپٹ پڑتا ہے جیسے بھوکا شیر ہرن پہ جھپٹ پڑتا ہے۔ دو ملکوں یا دو ریاستوں میں لڑائی کسی دیرینہ زمینی تنازعہ کے سبب بھی ہو سکتی

ہے۔ایک ملک کسی خطے پر اپنا قبضہ ظاہر کرتا ہے جبکہ دوسرا یہ جتاتا ہے کہ یہ ہمارے ملک کا حصہ ہے۔ یہ مسئلہ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ لڑائی سے ہی واحد حل نکلتا نظر آتا ہے۔ہاں کبھی ملکوں یا ریاستوں کے مابین لڑائی پانی کے مسئلہ پر بھی ہو جاتی ہے۔ جو چیزیں قدرت کے اختیار میں ہیں ان پر لوگ آپس میں دست گریبان کیوں ہوتے ہیں یہ معمہ ہے۔زمین نہ فرد کی ہے نہ ہی کوئی ملک یہ دعوی کرسکتا ہے کہ اس نے اس زمین کے ٹکڑے کو بنایا ہے پھر اس پر اپنا حق کیوں جتاتے ہیں۔؟

پہلے پہل دوریاستوں یا ملکوں کے درمیان خطرناک لڑائیاں ہوا کرتی تھیں جن کی تفصیل تاریخی کتابوں میں درج ہے اور ہمیں یہ حق حاصل نہیں کہ ہم تاریخ میں گھس کر جان سکے کہ وہ کیوں لڑتے تھے۔خون ریزی اور جانوں کے زیاں سے وہ کیوں خوش ہوتے تھے۔ان لڑائیوں کی بنیادی وجہ کیا ہوا کرتی تھی یہ ہمیں اس لیے نہیں پتا کہ ہم عینی شاہدین نہیں تھے لیکن جو قیاس کی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے وہ بتاتے ہیں کہ بعض حاکم اپنی انا کی تسکین ، اپنے رعب اور دبدبے کو قائم و دائم رکھنے کے لیے لڑائیاں لڑتے تھے۔ہار کا ہار ان کے گلے میں پڑ کر پھانسی کا پھندا بن جاتا تھا۔موجودہ زمانے میں ریاست یا ملک لڑائیاں کم ہی کرتے ہیں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اب وہ لڑائی پر کم اور ساز باز پر زیادہ یقین رکھتے ہیں۔موجودہ انسان اپنے اندرون سے لڑائی میں مصروف ہے کہ باہر کے دشمن سے اسے لڑنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔بہر حال لڑائی کسی سے بھی ہو جم کر لڑنی چاہیے تا کہ جیت کا سہرا سجا لیا جائے ورنہ ہار کا غم ملے تو کبھی کبھار عزت کے ساتھ سر بھی جاتا ہے۔



روگ، ریڈیو اور ادبی پروگرام

سائنس کی ایجادات کو دیکھ کر پہلے پہل انسانی عقل ششدر، حیران اور دنگ رہ جاتی تھی لیکن اب ایسا نہیں ہوتا۔ اب آئے روز نت نئی ایجادات ہوتی ہیں اور انسان بہتر سے بہترین کی جستجو میں رہتا ہے۔ پہلے انسان اکیلا رہتا تھا اب دنیا سے منسلک رہتا ہے۔ میڈیا کی بدولت رابطے میں رہنا آسان ہو گیا اور یہ دور بھی ایسا ہے کہ زمانے سے رابطے میں رہنے کے لیے میڈیا کے ساتھ رابطے میں رہنا ضروری ہے۔ ہر گھر میں ریڈیو، ٹی وی ایسے پڑے ہیں جیسے خوشحال گھرانوں میں کھانے پینے کی اشیاء۔ میرے گھر میں بھی کم سے کم تین چار ریڈیو ہوں گے۔ بعض لوگوں کو یقین نہیں آئے گا لیکن میں آپ کے ساتھ کسی بھی مقدس جگہ جانے کے لیے تیار ہوں جہاں میں یہ حلف اٹھا سکوں کہ واقعی میرے گھر میں چار ریڈیو ہیں۔ گھر میں ریڈیو کا انبار کیوں لگا ہے یہ ایک لمبی داستان ہے۔ آپ ناراض کیوں ہو رہے ہیں۔ آپ کے پاس فرصت ہے تو میں یہ لمبی داستان سنانے کے لیے تیار ہوں لیکن پہلے عرض کر دوں کہ اس انبار میں کوئی بھی موتی ایسا نہیں جو ہار بنانے کے کام آئے۔

بے کاری اور فرصت کے ایام میں وقت کے پہاڑ کو کاٹنے اور دودھ کی نہر نکالنے کے لیے کوئی بھی مشغلہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ کام میں دل لگنے کے ساتھ ساتھ مزہ بھی آئے تو اس سے بڑی خوش بختی ایک بے شغل کے لیے اور کیا ہو سکتی ہے۔ جو کام کی بوری آپ کاندھوں پر اٹھانے کی ٹھان لیتے ہیں پہلے اس کا خوب چرچہ کرتے ہیں تاکہ دوستوں دشمنوں کو پتا لگ سکے۔ ویسے بھی کام کے چرچے چار دانگ ہوتے ہیں چاہیے راز داری سے کیا جائے۔

چپ چاپ کسی بھی کام کا بس ارادہ کرنے کی دیر ہوتی ہے دوستوں اور دشمنوں کو پتا لگ ہی جاتا ہے۔ان کا کام ہی ہوتا ہے کہ وہ یہ جانکاری رکھے کہ کون کیا کر رہا ہے۔ہاں اگر کوئی فرصت کے لمحات گزار رہا ہے اور دوستوں کو پتا چلتا ہے تو تناؤ سے بچانے کے لیے وہ اس پر طرح طرح کے نسخے ویسے ہی آزماتے ہیں جیسے آج کے ڈاکٹر مریض کو سو طرح کی طبی تشخیص کے بعد بھی سو قسم کی دوائیاں کھلاتے ہیں۔یہ سوچ ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی دوائی سے ٹھیک ہو ہی جائے گا۔مریض ٹھیک نہ بھی ہوا تو چہارم پر ہمسائیوں اور رشتہ داروں کے لیے ضیافت کا انتظام کر کے ہی جائے گا۔بے کار شخص کو مختلف قسم کے وسوسے آتے ہیں۔ان سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان خود کو مصروف کر لے۔میں بے کار تھا تو دوستوں نے مجھے مصروف اور پریشانی سے دور رہنے کے لیے جو جو دوائی تجویز کی وہ باری باری کھائی پر ذہنی خلفشار دور نہ ہوا۔غرض مزید پریشانی سے بچنے کے لیے ڈاکٹر کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔جوں ہی گھر سے تیار ہو کر نکلا راستے میں ایک پرانے عزیز سے ملاقات ہوئی۔اس کی سب سے اچھی عادت یہ ہے کہ جب تک سو سوال نہیں کرتا تب تک جان نہیں چھوڑتا۔سلام کو رہنے دیا اور سیدھے گلے لگا کر ایک سانس میں پوچھا کہ کیسے ہو، کہاں جا رہے ہو، کیوں جا رہے ہو۔ان سوالات کے جوابات دینے ہی والا تھا کہ اس نے ایک اور سوال کیا کہ اتنے پریشان کیوں ہو۔اس کیوں کا میں بھی جواب تلاش کرنے نکلا تھا۔سارا معاملہ بیان کیا۔صورتحال کو جاننے کے بعد توقف کیا اور گہرے خیالات میں ڈوب گیا۔قوی امکان ہے کہ بڑے بڑے فلسفی اسی انداز سے ایک انگلی گال پر رکھ کر دور آسمان کی وسعتوں کو دیکھ کر مسائل کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہوں گے۔اس سے پہلے میں کچھ کہتا سنجیدگی اور سکوت کو توڑتے ہوئے گویا ہوئے کہ ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں میرے پاس ایک ترکیب ہے۔میں بھی ویسے ہی متوجہ ہوا جیسے ایتھنز میں افلاطون کے شاگردان کی باتوں کو سننے کے لیے ہم تن گوش ہوتے تھے۔قبلہ نے علاج بتایا کہ ایک عدد ریڈیو خرید لو۔ریڈیو میں موسیقی، کھیل کے متعلق پروگرام، صحت، طب، فلسفہ، حال کے ساتھ ساتھ موسم کی جانکاری سب کچھ ملتا ہے۔ادبی پروگرام ہو یا تاریخی قصے، مذہب ہو یا سیاست بڑے بڑے

سور ماؤں کو سننے کے لیے ریڈیو سے بہتر کچھ نہیں۔ تفریح کی تفریح اور علم کا سمندر مفت ملے گا۔ میں اس تجویز پر غور کرنے ہی والا تھا کہ پھر گویا ہوئے کہ ریڈیو کو دن بھر سننے سے وقت کا پتا ہی نہیں چلتا۔ مزید کہنے لگے کہ ریڈیو سننے سے بڑے بڑے ڈاکٹروں کے پاس نہیں جانا پڑتا چونکہ انسان ذہنی انتشار سے دور رہتا ہے۔ انسان ڈاکٹر کی لکھی ان قیمتی دواؤں کو کھانے اور خریدنے سے بھی بچ جاتا ہے جو وہ انتشار اور غم کو دور کرنے کے لیے لکھ دیتا ہے۔ ہر فرد پریشانیوں اور ذہنی انتشار کا شکار ہے اگر دن میں صرف ایک آدھ گھنٹہ انسان ریڈیو سن لے تو دل اطمینان اور ذہن سکون میں رہے گا۔ مجھ سے رخصت لینے سے پہلے وعدہ لیا کہ ریڈیو ضرور سنو گے۔ مجھے مرزا بے تحاشہ یاد آئے۔ مرزا کہا کرتے تھے کہ ریڈیو سننے کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ بکواس کرنے والے کی شکل نہیں دکھائی دیتی اور انسان ان گناہوں سے بچ جاتا ہے جو پروگرام سماعتوں کی نذر کرنے والے کی شکل کو دیکھنے کے بعد گالیاں دینے سے اس کے سر چڑھ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر کے پاس جانے کے بجائے میں نے غنیمت جانا کہ گھر واپس آیا جائے۔ ریڈیو تو گھر میں تین چار تھے اس لیے سیدھے گھر آیا اور جتنے بھی ریڈیو پشتنی تھے جو پڑ دادا، دادا، والد اور میں نے خریدے تھے ڈھونڈنے کی سعی کرنے لگا۔ دس منٹوں میں چار ریڈیو جمع کئے۔ ایک کا سوچ آن کرنے کی کوشش کی تو ہاتھ میں آ گیا۔ ماتھے پر شکن تک نہ آئے اور باقی تین کی طرف بڑی فخریہ انداز میں دیکھا۔ دوسرے ریڈیو کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ فون اٹھایا تو دوست کی پر جوش آواز آئی کہ بھائی فلاں ایف ایم اسٹیشن پر ادبی پروگرام چل رہا ہے سن لو مزہ آئے گا۔ پروگرام سننے کے لیے دوسرے ریڈیو کی طرف بڑھا جو دادا جان کی آخری نشانی تھا تو پتا چلا کہ یہ قدیم زمانے کا ریڈیو ہے اس میں ایف ایم وغیرہ نہیں چلتا۔ اس کو معتبر نشانی جان کر الگ رکھا اور تیسرے ریڈیو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سوچ رہا تھا کہ دادا جان کا ریڈیو پرانا ہے والد صاحب نے جو ریڈیو لایا تھا اس میں ایف ایم ضرور ہوگا۔ ادبی پروگرام سننے میں لطف آئے گا۔ تیسرے ریڈیو کو گرم جوشی سے آن کیا۔ ریڈیو تو نہیں چلا البتہ یہ انکشاف ہوا کہ ریڈیو کے بیٹری موجود نہیں وہ خراب ہوگئی تھی۔ مختصر

یہ کہ اس ریڈیو سے بھی تسکین نہ ہوئی اور باری اپنے ہاتھوں خریدے ہوئے ریڈیو کی آئی۔ابھی غصے کا پارہ اتنا بھی نہیں چڑھا تھا کہ اپنے دانت پیس کر گھر سے لے کر ہمسائیوں اور پھر دنیا کو گالیاں دوں۔امید کی کرن چوتھے ریڈیو کی صورت روشن تھی۔

جو ریڈیو میں نے خود خریدا تھا اس کو بڑے اہتمام سے الماری میں رکھا تھا۔ غلاف صاف ستھری چڑھا کر رکھی تھی۔الماری کھولی ریڈیو کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن حیرانی ہوئی جب ہاتھ میں خالی غلاف آیا۔غلاف موجود تھی ریڈیو ندارد۔اب ماتھے پر شکن اور خون کی گردش تیز ہوگئی تھی۔اوپر سے یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ ادبی پروگرام کا بڑا حصہ نکل چکا ہوگا۔زوردار آواز دے کر گھر والوں کو بلایا اور پولیس کی طرح گھر والوں سے ریڈیو کے غائب ہونے کی پوچھ تاچھ کرنے لگا۔پولیس کے سامنے جوان بھاگے ہوا جوڑا جس طرح مختلف بیانات دیتا ہے ویسے ہی گھر والے مختلف قسم کی دلائل دینے لگے۔سچ باہر نکل ہی آتا ہے۔بار بار کے سوالات سے آخر کار یہ انکشاف ہو ہی گیا کہ ریڈیو کو اغوا کرنے میں بچوں کا ہاتھ تھا۔کھیل کھیل میں بچوں نے ریڈیو کی چیر پھاڑ کر دی تھی اور ایک ایک پرزے کو الگ الگ کر دیا تھا۔دکھ ریڈیو کے ٹوٹنے کا نہیں کہ گھروں میں چیزیں ٹوٹتی رہتی ہیں افسوس اس بات کا تھا کہ ایک ادبی پروگرام سن نہ سکا۔پروگرام جوں ہی اختتام ہوا تو دوست نے فون پر یہ جانکاری دی کہ حال ہی میں اپنے پیسوں اور مروت کے دم پر مشہوری پانے والے شاعر بدحالی صاحب کو ادبی پروگرام میں بلایا گیا تھا۔سن کر بڑی مسرت ہوئی اور اللہ کا شکر بجا لایا کہ ریڈیو خراب تھا ورنہ پروگرام سن کر ذہن خراب ہو جاتا۔



گائے بھی چوری ہوئی

ذکر پچھلی صدی کا نہیں بلکہ پچھلے سال کا ہے کہ چوروں کا دبدبہ زوروں پر تھا۔ ہر وہ شئے چرا لی جاتی تھی جو گھر میں، گھر سے باہر آنگن میں یا سڑک پر دکھائی دیتی تھی۔ نومبر کا ذکر ہے کہ ایک چور پارٹی نے راتوں میں گشت کرنے کیا شروع کئے کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہر گھر سے صبح رونے کی آوازیں زور زور سے آتی تھیں۔ حال احوال پوچھنے پر معلوم ہوتا تھا کہ چوروں نے سونا چرایا ہے، برتن غائب ہیں، آنگن میں اسکوٹر رکھا تھا وہ چوری ہو گیا ہے، دکان کا تالا ٹوٹا ہوا ہے، غرض ہر وہ شئے جو قیمتی تھی چوری کر لی جاتی تھی۔ چوری چکاری کا سیزن تھا اور ہر طرف واویلا مچی ہوئی تھی۔ روز خبر آتی تھی فلاں گھر میں چوری کی واردات ہوئی ہے اور فلاں شئے غائب ہے۔ ہمارے گھر میں بھی ایک دو وارداتیں ایسی رونما ہوئیں لیکن رونے کی آوازیں اتنی بلند نہیں ہوتی تھی کہ صبح سویرے لوگوں کی نیند میں خلل واقع ہو جائے۔ ایک دن یہ خبر آئی کہ گھر میں برتن کے علاوہ گیس سلنڈر چوری ہوا ہے۔ صبر و قناعت کے سوا چارہ نہ تھا وہی کیا گیا۔ چند ماہ گزر گئے اور یہ خبر بھی لوگوں کے کانوں تک پہنچی کہ بائیسیکل چوری ہو گیا ہے۔ خود ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی، پولیس کے پاس رپورٹ لکھائی گئی لیکن وہ رپورٹ صرف سفید کاغذ کو نیلی سیاہی سے آلودہ کرنے تک محدود رہی۔ برتن چوری ہونے پر عورتوں نے چند آنسوں تو بہائے تھے کیونکہ برتن انہیں عزیز تھے لیکن جب بائسیکل چوری ہوئی تو خاموشی چھائی ہوئی تھی اور بس مردوں کے ماتھے شکن آلود تھے۔ چچا کا برا حال تھا کیونکہ وہی بہ نفس نفیس اس بائسیکل پر کام کے لیے نکل جاتے تھے۔ روٹی ختم

ہوئی چچا نے بائسیکل نکالی، کہیں جانا ہے چچا نے بائسیکل چمکائی کپڑے پہنے اور نکل گئے۔ افسوس تھا تو چچا کو کہ اس کی سب سے پیاری اور قیمتی شئے چوری ہوگئی تھی۔

ایک صبح اذان کے بعد زور شور سے رونے کی آوازیں سماعتوں سے ٹکرائی۔ وسوسوں سے برا حال ہوا کہ خدا خیر کرے کوئی رشتہ دار مرنہ گیا ہو یا کوئی ہمسایہ عزرائیل سے ملاقات کا خواہشمند تو نہیں تھا۔ جلدی جلدی کپڑے پہنے کے بعد جوں ہی گھر سے باہر نکلے تو پتا چلا کہ گائے بھی چوری ہوگئی ہے۔ یہ چوری کسی سانحے سے کم نہ تھی اور باقی تمام چوریاں اس کے مقابلے میں چھوٹی تھیں۔ صرف ہماری گائے ہی نہیں بلکہ چند ہمسائیوں کے گئوشالے بھی خالی کئے گئے تھے۔ پچھتاوا بہت ہوا اور گھر میں تعزیت کا سا ماحول بنا۔ جس طرح کوئی فوت ہوجائے تو مرنے والے کے اوصاف گنائے جاتے ہیں اور دعا مغفرت کی جاتی ہے اسی طرح ہمسائیوں نے گھر آکر گائے کی رنگت، دودھ دینے کی مقدار، گھاس کھانے کی رفتار غرض گائے کی خوبیوں کا خوب چرچا کیا۔ کچھ چوروں کو بھی کوستے تھے تو کچھ انسانوں کو دعائیں دیتے تھے کہ انسان بچ گئے ہیں اس کا شکر کرنا چاہیے۔ ایسے بھی آئے جنہوں نے بہت سارے گائے چوری کے قصے سنائے۔ قادر بادشاہ جس کا اصل نام عبدل قادر خان تھا نے قصہ سنایا کہ جب ہمارے گھر میں چوری ہوئی اور گائے کے ساتھ ساتھ دو بیل بھی چوری ہوئے تو میں بہت رویا۔ اس سے قبل میں زندگی میں کبھی نہیں رویا تھا۔ بسیار تلاش کے باوجود کوئی پتہ نہ ملا تو میں نے پھٹی ٹوپی اور پرانا پھیرن زیب تن کیا اور گھر گھر جا کر بھیک مانگنے لگا۔ شام کو جو کچھ جمع ہوتا تھا وہ محلّہ کی مسجد شریف کو دے آتا تھا۔ دو ماہ اسی فقیری میں گزر گئے، کچھ ہاتھ نہ آیا۔ ایک دن میں دور دراز کے گاؤں میں دن کے تقریباً دو بجے ایک گھر کے آنگن میں پہنچا تو میں نے اپنے چہیتے بیل کو دیکھا۔ میں خوشی سے جھوم اٹھا اور اس گھر پر نشان لگا کر جلدی جلدی اپنے گھر واپس آیا۔ نئے کپڑے پہنے اور نشان زدہ گھر کی طرف روانہ ہوا۔ جوں ہی اس آنگن میں پہنچا تو ایک آدمی نظر آیا، جس نے بارعب اور باآواز بلند پوچھا کہ کیا چاہیے اور ادھر ادھر کیا ڈھونڈ رہے ہو۔ میں نے اس کو قریب بلایا۔ جب وہ ایک دو فٹ کی دوری پر کھڑا ہوا تو میں نے اس کے گال پر زوردار تھپڑ مارا جس سے وہ ہل گیا۔

اب میں نے گرج دار آواز میں پوچھا کہ یہ بیل کہاں سے لایا ہے؟ جلدی بتاؤ ورنہ تمہاری خیر نہیں۔ یہ میرا بیل ہے اس کے ساتھ ایک اور بیل اور گائے بھی چوری ہوئی تھی۔ مجھے جلدی بتاؤ کہ گائے اور بیل کہاں ہے؟۔ چار پانچ تھپڑ لگانے کے بعد اس نے اقرار کیا کہ میں نے ہی چوری کی تھی اور دو جانور میں نے فروخت کئے ہیں۔ جن افراد نے وہ خریدے تھے میں ان کے گھر گیا اور اپنی گائے اور بیل کو ہنسی خوشی گھر واپس لے لایا۔

دوسرے دن حسن بب نے یہ قصہ سنایا کہ جب میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے سے تازہ تازہ سبکدوش ہوا تھا اور سارا وقت پوتا پوتیوں سے کھیل کود اور لاڈ پیار میں گزر جاتا تھا تو ایک دن ہمارے محلے میں تقریباً بیس کے قریب گائیں ایک ساتھ چوری ہوئیں جن میں میری بھی گائے تھی۔ قصہ مختصر چونکہ میری جان پہچان تھی اور میں ہمسائیوں سمیت ایس پی کے پاس پہنچا اور اسے فوراً گائے تلاش کرنے کو کہا۔ ایس پی میرے نام سے واقف نہیں تھا اور میں نے پھیرن پہن رکھا تھا۔ ایس پی نے تین چوروں کو بلایا اور پوچھ تاچھ کرنے کے بجائے انہیں کرسی پر بیٹھایا، سگریٹ جلا کر دی اور ان کے لیے چائے منگوائی۔ ایس پی کا رویے دیکھ کر مجھے غصہ آیا اور میں نے تمام ہمسائیوں کو یہ پیغام دیا کہ یہ چور اور پولیس کی ملی بھگت ہے۔ یہاں رکنا فضول ہے ہمیں خود ہی کچھ کرنا چاہیے۔ شہر شہر اور گاؤں گاؤں ایک ماہ تک ڈھونڈتے رہے کوئی سراغ نہ ملا۔ ایک دن صبح صبح ایک ہمسائے نے یہ خبر سنائی کہ میری گائے فلاں گاؤں میں تھی اور میں نے اس کو گھر لایا ہے۔ ایک گائے کا پتا کیا نکلا بیس کی بیس گائیں چندروز میں ہمارے گئوشالوں میں تھیں۔ بس اچھی قسمت ہونی چاہیے چوری ہوئی چیزیں خود بخود نکل آتی ہیں ورنہ کھوئی ہوئی چیز ملنا محال ہی نہیں ناممکن ہے۔

شریف الدین جو گاؤں میں شریف چرسی کے نام سے مشہور ہے سلام دعا کے بعد گویا ہوئے کہ طالع تاباں اور قسمت چمکدار ہونی چاہیے۔ پچھلے سال نومبر کے پہلے ہی ہفتے میں ہمارے گھر میں بھی گائے چوری کی واردات ہوئی اور ہمیں خبر ہی نہ ہوئی۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو رمضان بب کا فون آیا۔ تند لہجے میں اس نے جواب طلبی چاہیے کہ کیا تم نے گائے بیچ دی ہے۔ میں نے نفی میں جواب دیا تو بولیں پھر تمہاری گائے کہاں ہے۔ میں نے جواباً

کہا کہ گئوشالہ میں ہوگی اور کہاں ۔رمضان بب نے حکم دیا کہ چائے بنا کے رکھنا میں آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔رمضان بب گائے کے ساتھ آنگن میں آدھے گھنٹے بعد وارد ہوئے۔ پھر قصہ سنایا کہ صبح جب میں اٹھا تو ایک شخص کو دیکھا جو گائے کی رسی تھامے چلے جار ہا تھا۔ میں نے رکنے کا اشارہ کیا اور دریافت کیا کہ کیا شریف الدین نے گائے بیچ دی ہے۔وہ پہلے ہڑبڑایا اور پھر گھبرایا۔رسی چھوڑ کر یہ جاوہ جا ایسے بھاگا جیسے میڈل جیتنے کی دوڑ ہو رہی ہو۔میں نے گائے کی رسی تھامی اور سیدھے یہاں پہنچادی۔

کسی رشتہ دار سے فون پر بات ہوتی یا وہ خود خبر گیری کے لیے آتے تو پہلے یہی سوال کرتے تھے کہ اچھا اب گائے بھی چوری ہوگئی ہے۔گلی گلی نگر نگر، جس چورا ہے، نکڑ پر چند لوگ جمع ہو جاتے وہاں باتوں کا سلسلہ گائے کی چوری سے شروع اور ایسی وارداتیں جو پچھلے سالوں میں رونما ہوئی ہیں کی روداد کو بیان کرنے کے بعد ہی ختم ہوتیں۔ چند روز بعد گھر آنے والوں کی تعداد میں تو کمی واقع ہوئی لیکن مشورہ دینے والوں میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔کوئی چائے کی چسکیاں لیتے لیتے دور دراز علاقوں میں ڈھونڈنے کا مشورہ دیتا تو کوئی پیر صاحب کا پتہ دے دیتا کہ فلاں جگہ پیر صاحب ہیں جو ضرور گائے کو کھوج نکالنے میں مدد فرمائیں گے۔بس وہ چار پانچ ہزار میں مان جائیں گے اور چند روز بعد گائے آنگن میں ہوگی۔کسی نے صبر کرنے کی تلقین کی تو کوئی رب کی رضا میں راضی رہنے کا مشورہ دے کر نکل جاتا۔ایسے بھی رب کے نیک بندے تھے جو پورا گئوشالہ لوہے اور فولاد سے تعمیر کرنے کا قیمتی مشورہ دے کر چلے گئے اور کچھ کھاتے پیتے لوگ راتوں کو جاگنے اور جاگتے رہو کی آواز لگانے کے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کا کہہ کر گئے۔اتنا دکھ، صدمہ اور سر درد گائے چوری ہونے کی وجہ سے نہ ہوا جتنا لوگوں کے مشوروں نے تنگ کیا۔کوئی بھی شئے چوری ہو جائے اس کا ماتم ہر گز نہیں کرنا چاہیے ورنہ دوست اور رشتہ دار واقعی تعزیت کرنے آجاتے ہیں اور ماحول کو سوگوار کر کے چلے جاتے ہیں۔چوریوں کا سیزن ہے اگر آپ کے گھر میں بھی گائے ہے تو خیال رکھے گا ورنہ گائے چوری ہونے کے بعد پچھتاوا ہوگا جو مہنگا پڑتا ہے۔



پھسلنا

جب پیر پھسل جائے ، ٹانگیں ڈگمگائیں اور جسم لڑکھڑائے تو گرنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ پھسلنا پیروں کی کارستانی ہے۔ پیر جب توازن برقرار نہیں رکھ پاتے اور مقررہ جگہ سے کھسک جاتے ہیں تو انسان گر جاتا ہے۔ ہر انسان کو کوئی نہ کوئی خوف اپنی جھکڑ میں لے لیتا ہے۔ پھسلنے کا بھی خوف ہوتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ پھسلنے کا خوف گر کر ہی ختم ہوتا ہے۔ کار خانہ قدرت وسیع ہے، یہاں انسان ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت سی چیزیں پھسلتی اور گرتی ہیں۔ جس طرح مٹھی سے ریت پھسل جاتی ہے اسی طرح انسان کی زندگی سے خواب ، ارمان، مقام ، رتبہ اور کبھی کبھار ارادے پھسل جاتے ہیں۔ انسان کی موت دو طرح سے واقع ہوتی ہے جسمانی موت جس میں انسان کی میت کو غسل دینے کے بعد کفن دیا جاتا ہے اور دفن کیا جاتا ہے۔ دوسری موت جذبات کی موت ہے جس میں انسان زندہ تو رہتا ہے مگر اذیت اور کرب کے ساتھ۔ انسان کے سر سے دستار گر جائے تو دوسری قسم کی موت واقع ہو جاتی ہے پھر وہ نہ جیتا ہے نہ مرتا ہے بلکہ تڑپتا اور ترستا ہے۔ کسی اونچے پہاڑی سلسلے اور راستے سے گاڑی پھسل جائی تو موت واقع ہوتی ہے۔ انسان عزت و مرتبے کی کرسی سے پھسل جائے تو بھی مر ہی جاتا ہے۔ اس مرنے اور اس مرنے میں فرق اتنا ہے کہ پہلے میں لوگ کفن دے کے مٹی میں دفناتے ہیں دوسری موت واقع ہو جائے تو دلوں میں قبریں بنتی ہیں اور باتوں اور طعنوں سے لاش کو جلایا جاتا ہے۔

پھسل کر گرنے والا رنجیدہ اور سنجیدہ ہوتا ہے کبھی کبھار تو رو بھی پڑتا ہے لیکن اس

منظر کو دیکھنے والے محظوظ ہوتے ہیں۔ ہاں اگر پھسل کر گرنے والا شخص گر کر مر جائے تو دیکھنے والے بھی کبیدہ خاطر ہوتے ہیں۔ پھر وہ ہنستے نہیں بلکہ ان کے چہرے سے ہنسی ایسے غائب ہو جاتی ہے جیسے ساٹھ ستر سال کے بعد صحت۔ ہاتھ سے ڈور اور رشتوں کا پھسلنا ہی مشہور نہیں زندگی میں بہت سی چیزیں پھسل کر اتنا نیچے چلی جاتی ہیں کہ ان تک رسائی ممکن ہی نہیں ہو پاتی۔ جو چیزیں ایک بار اپنے مقام اور جگہ سے پھسل جاتی ہیں وہ اپنے مقام پر پھر نہیں آتی چاہیے کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے۔

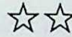
مرد ہو یا عورت دونوں پھسل بھی سکتے ہیں اور گر بھی سکتے ہیں۔ عورتیں فطرتاً لالچی ہوتی ہیں اس لیے یہ پیسے کی چکناہٹ اور، عیش و آرام کی چکناوٹ دیکھ کر پھسل جاتی ہیں۔ کہرے پر، برف پر، کیچڑ میں قوی امکان ہے کہ مرد اور عورت دونوں پھسل جائے۔ مرزا کہتے ہیں کہ مرد خودغرض اور خوبصورتی کا رسیا ہوتا ہے کیلے کے چھلکے اور بھرپور رس بھری جوانی پر جلدی پھسل جاتا ہے۔ ایک بار پھسل گیا تو اس انداز سے پھسلتا ہی چلا جاتا ہے جس طرح بریک فیل ہوئی گاڑی رکنے کا نام نہیں لیتی۔ کوئی بھی ایسی چیز پاؤں کے نیچے آ جائے جس پر انسان پھسل سکتا ہے تو کوشش کرنی چاہیے کہ پھسل جانے کے بعد جلدی خود کو سنبھال لیا جائے۔ بعض لوگ اگر پھسل جائے تو زیادہ سے زیادہ ان کی ہڈیاں ٹوٹتی ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ خود ٹھیک ہو جاتی ہیں یا زخم آتے ہیں جن کو وقت خود ہی بھر دیتا ہے۔ لیکن جوانی میں پہنچ کر پھسلنے والا نہ گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔ اس کی زندگی ہی نرخ نہیں بنتی بلکہ اس کے رشتہ دار، گھر والے اور رفقاء بھی شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ عزت کا جنازہ اٹھتا ہے اور بھروسہ کی موت ہو جاتی ہے۔

پھسلنا ناکامی کا دوسرا نام ہے۔ کچھ لوگ بہک جاتے ہیں بہکنے کے بعد لڑکھڑاتے ہیں اور آخر کار پھسل جاتے ہیں۔ یہ اکیلے نہیں پھسلتے بلکہ ان کی صحبت میں جتنے بھی دوست احباب اور سنگی ہوتے ہیں ان کو بھی بہلا پھسلا کر یہ گرانے کے ارادے رکھتے ہیں۔ پھسلنے کا عمل کسی بھی عمر میں پیش آ سکتا ہے۔ بچپن ہو یا جوانی، بوڑھا ہو یا قریب المرگ انسان کسی بھی عمر میں کسی بھی وقت پھسل سکتا ہے اور گر سکتا ہے۔ بچپن میں پھسلنے والے کو شرمندگی نہیں

ہوتی وہ مزے سے پھسل کر جلدی سنبھل جاتا ہے۔ بچپن میں یہ پتا نہیں ہوتا کہ کیوں پھسلا جارہا ہے۔ مزہ اور لطف کی خاطر یہ حرکت کی جاتی ہے اور واقعی یہ عمل مزہ بھی دیتا ہے۔ مضبوط قوی جب مضمحل ہونے لگتے ہیں، جب جوانی کی لگام ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور پیری اپنی مشقیں سختی سے کستی ہے، وقت کا گھوڑا جب سرپٹ بھاگنے لگتا ہے تو بڑے بڑے سورما اور شہسواروں کی لگام ڈھیلی پڑتی ہے اور وہ پھسل کر منہ کے بل گرتے ہیں۔ جس طرح زلزلے سے زمین ہلتی ہے اور سب کے ہوش وحواس باختہ کرتی ہے ویسا ہی حال حرام خوری سے ہوتا ہے۔ حرام خوری سے زمین اور وہ راستہ چکنا ہوتا ہے جس پر انسان کو عمر بھر چلنا ہوتا ہے۔ اگر وہ حلال اور حرام میں تمیز کرنا بول جائے تو پھسل پھسل کر گرتا ہے اور گر گر کر پھلستا ہے۔ حلال خوری سے پاؤں کے نیچے کی زمین ہی مضبوط نہیں ہوتی بلکہ پاؤں طاقتور اور راستہ پختہ ہوتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ بے ایمانی اور حرام خوری کے دلدل میں پھسلنے سے بہتر ہے کیچڑ میں پھسلنا اور رپٹنا۔ کیچڑ میں گرنے سے انسان اتنا ذلیل وخوار نہیں ہوتا جتنا کردار میں داغ لگنے سے ہوتا ہے۔ کیچڑ میں پھسل کر انسان صاف ہوجاتا ہے لیکن من میں میل آجائے، حرام خوری کی عادت پڑ جائے تو یہ میل نہ دھونے سے صاف ہوتا ہے نہ ہی دنیا کے کسی پانی سے صاف ہوتا ہے۔

پھسل کر گرنا ضروری ہے کیونکہ گر کر ہی انسان میں اٹھ کھڑے ہونے کی صلاحیت اور ہمت پیدا ہوتی ہے۔ انسان میں پھسل پھسل کر گرنے اور گر کر اٹھنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی تو دنیا جہاں کی کامیابیاں اور کامرانیاں اس کی جھولی میں سمٹ کر آجاتی ہیں۔ سنبھل سنبھل کر چلنے میں خطرہ لگا رہتا ہے اور دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ اگر اچانک انسان کی توجہ ہٹ گئی تو وہ پھسل سکتا ہے۔ جو پہلی بار ناکامی کا سامنا کرتا ہے اس کو اذیت کی حد تک دشواری کا سامنا رہتا ہے۔ جو پھسل کر اٹھنے اور گر کر چلنے کا حوصلہ رکھتے ہیں ان کو مشکلات کا سامنا نہیں رہتا اور نہ ہی وہ پھونک پھونک کر قدم رکھنے کے ڈر اور خوف میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ کامیاب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انسان ناکامی کا خوف دل سے نکال پھینکے۔ انسان تب ہی دوڑ سکتا ہے جب اسے اپنے ٹانگوں پر اٹھ کھڑے ہونے اور چلنے کا حوصلہ آجائے۔

مرزا کہتے ہیں کہ سینہ تان کر اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہوکر چلنے والے پھسلتے ہیں رینگے والے سرک سکتے ہیں پھسل نہیں سکتے۔ جو انسان جذبہ ہمت اور شجاعت رکھتا ہے وہ کبھی پھسل نہیں سکتا اگر پھسل بھی جائے تو جلد سنبھل جاتا ہے۔ پھسل کر گرنا اور گر کر اسی حالت میں رہنا کمال نہیں کمال تو یہ ہے کہ اونچائی سے پھسلنے کے بعد انسان کو مزید بلندی عطا ہو جائے۔۔۔۔!



انتظار

زندگی میں کوئی فرد واحد اور مرد مجاہد اگر کچھ کرتا ہے تو وہ فقط انتظار ہے۔ بچہ اس انتظار میں سارا بچپن گزار دیتا ہے کہ وہ جوان ہوگا، جوان اس انتظار میں ہے کہ کب دلہا بنے گا اور دلہا بننے کے بعد باپ بننے کے انتظار میں بیقرار اور بے چین دنوں کو گنتا رہتا ہے۔ بیمار بھی حالت انتظار میں ہے کہ وہ شفایاب ہوکر زندگی کی وادیوں میں پھر سے گھوم پھیر کر لطف کشید کرے گا۔ پریشانی میں مبتلا شخص خوشی اور سکون کے انتظار میں پل پل اور گھڑیاں گن گن کر جی رہا ہے۔ یہاں تک کہ قبر بھی انسان کے انتظار میں باہیں پھیلائے بیٹھی ہے۔ زندگی جینے اور آگے بڑھنے کی واحد وجہ انتظار ہے۔ انتظار سے ہم خوشی اور غم، سکون اور بے سکونی، الجھن، بے چینی اور مختلف وسوسوں کا شکار ہوتے ہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ وسوسوں کا شکار بیماری میں مبتلا اور محبوبہ کا انتظار کرنے والا شخص ہوتا ہے۔

سرکاری دفاتر ہوں یا اسپتال صبح سے شام تک وہاں انتظار ہی کرایا جاتا ہے۔ دفاتر میں صاحب اور اسپتالوں میں ڈاکٹر کا انتظار کرنا ہی پڑتا ہے کہ اس کے سوا چارہ نہیں۔ کھانستے ہوئے عمر رسیدہ اشخاص، جوان خواتین، دودھ پیتے بچے، پیر بھاری خواتین، تکلیف میں مبتلا کراہتے بیمار، زخمی مریض، پریشان مائیں اور ہنستے بچے سارے حالات انتظار میں بس دروازے کو تکتے ہیں کہ کب ڈاکٹر آئے اور ان کے قابل رحم حالات اتنے بدل جائے کہ انہیں اطمینان ہو کہ ڈاکٹر آگئے ہیں اور اب امید ہے کہ ان کے درد میں افاقہ ہو جائے گا۔ مرزا کہتے ہیں کہ اسپتالوں میں انتظار گاہ کا واحد اور اکلوتا مقصد یہی ہے کہ نہ آنے والے

ڈاکٹر کا انتظار کر کر کے مریض تھک ہار کر گھر جائیں۔ ہمارے ہاں چند ہی لوگ انتظار کرتے ہیں باقی تو جلد بازی کے مقابلوں میں حصے لینے کو آئے ہیں۔ ماں اپنے گمشدہ لخت جگر کا انتظار شدت سے کرتی ہے۔ اس کی امید کی ناؤ ڈوبتی نہیں ہاں کبھی کبھار ہچکولے ضرور کھاتی ہے۔ گمشدہ بیٹے کے انتظار میں گھل گھل کر دن گزارتی ہے پر انتظار کرنا نہیں چھوڑتی۔ تڑپتی، روتی بسورتی ہے لیکن منتظر رہتی ہے کہ شاید فراموشیدہ راہ راست پر آئے۔ مسافر سفر شروع کرنے سے پہلے انتظار کرتے ہیں اس ٹرین اور بس کا جو پہلے ہی کچھا کھچ بھری ہوئی ہوتی ہے اور جس میں تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں ہوتی۔ گاڑیوں کی افراط بڑھ گئی ہے اور ہر گھر میں دو چار گاڑیاں موجود ہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ لوگوں میں انتظار کرنے کا مادہ اور قوت ختم ہو گئی ہے بعض باغیرت لوگ جب انتظار کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو جذبے جلد بازی انہیں تب تک چین سے بیٹھنے نہیں دیتا جب تک وہ اپنی گاڑی نہیں لاتے اور یوں انتظار کرنے کی کیفیت اور لذت سے وہ محروم ہو جاتے ہیں۔ مسافر پہلے جس شدت سے ٹرین اور بس کا انتظار کرتے تھے اسی شدت اور جذبے سے ہمارے ہاں بے شغل کام اور روزگار کا انتظار کرتے ہیں۔ یہ انتظار کبھی ختم نہیں ہوتا اور یہ بے روزگار برسرِ روزگار بھی نہیں ہوتے۔ سرکاری نوکری کے ملنے اور اچھی بیوی پانے کے انتظار میں بعض لوگ تو عدم سدھارے گئے۔ مرزا کہتے ہیں کہ اچھی بیوی اور سرکاری نوکری قسمت والوں کو ہی ملتی ہے۔

انتظار ایک کیفیت کا نام ہے جو لذت اور لطف کے ساتھ ساتھ کرب اور رنج میں مبتلا کر دیتی ہے۔ عاشق محبوب کے انتظار میں گھڑیاں گنتا رہتا ہے اور رات کی تاریکی دن کے اجالے کا انتظار کرتی ہے۔ صبح پھر رات کے انتظار میں اپنی ساعتیں گزارتی ہے۔ یوں ہی دن رات میں بدل جاتا ہے اور رات دن میں، سارا کھیل انتظار کا ہی ہے۔ راہ تکنا اور انتظار کرنا عاشقوں کی قدیم ریت ہے۔ عاشق اپنے محبوب کا انتظار اور وصل کی خواہش میں پل پل مرتا اور لمحہ بہ لمحہ تڑپتا ہے۔ نہ صرف محبوب کے انتظار میں تڑپتا، ترستا اور آہیں بھرتا ہے بلکہ روتا بسورتا، اشک بہاتا اور آہ و آزاری کرتا ہے۔ جب وصال نصیب میں نہ ہو تو غالب کو یاد کرتا ہے اور دہراتا ہے کہ۔۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ایک عاشق کے لیے انتظار کی وہ گھڑیاں سب سے زیادہ مشکل ہوتی ہیں جب اس کے محبوب نے اسے آنے کا وعدہ کیا ہو اور وہ مقررہ جگہ اور وقت پر نہ پہنچ پائے۔ کچھ یک طرفہ عاشق ایسے بھی ہوتے ہیں جو راستے میں کھڑے اپنے محبوب کی ایک جھلک دیکھنے کے انتظار میں ہوتے ہیں جب کہ ان کی محبوبہ نے آنے کا کوئی وعدہ کیا ہوتا ہے، نہ یقین دہانی کی ہوتی ہے اور نہ ہی آنے کی امید دلائی ہوتی ہے۔ ان یک طرفہ عاشقوں کا تو موقف یہ ہوتا ہے کہ ____

نہ کوئی وعدہ ، نہ کوئی یقین نہ کوئی امید
ہمیں تو تیرا انتظار کرنا ہے۔

ایسے بھی عاشق ہیں جو کہتے ہیں کہ ''کہیں وہ آ کے مٹا دیں نہ انتظار کا لطف'' کیونکہ وہ واقف ہے کہ وصال میں وہ مزہ نہیں جو انتظار کی تڑپ میں سرور اور مزہ ہے۔ محبت کا سارا کھیل ہی انتظار کا ہے۔ عاشق اپنے محبوب کے آنے کا انتظار دو آنکھوں سے نہیں کرتا بلکہ سارے جسم کو آنکھیں بنا کر اس راہ کو تکتا ہے جس سے محبوب کے آنے کا گمان بھی ہو۔ مرزا کہتے ہیں کہ بعض عاشق تو انتظار کرتے کرتے پتھر ہو جاتے ہیں لیکن وہ بت نظر نہیں آتا جس کی مورت دل میں بسا رکھتے ہیں۔

انتظار کا کمال ہی یہی ہے کہ مومن ہو یا شیطان، سپاہی ہو، جنگجو یا سرکاری ملازم سبھی انتظار کرتے ہیں۔ مومن اللہ کی رحمت اور قرب کے انتظار میں عبادتوں میں مشغول رہتا ہے۔ شیطان اس موقعے کے انتظار میں کہ کب ایک سیدھے راہ پر چلنے والے بندے کو بھٹکا دے۔ سپاہی میدان جنگ میں لڑتے لڑتے مدد کے انتظار میں ہوتا ہے اور سرکاری ملازم دن گن گن کر مہینے کی آخر تاریخ کے انتظار میں کہ کب تنخواہ آئے۔ یہ انتظار ہی ہے جو مومن کو امید اور جنگجو کو لڑنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ کسی عاقل نے مرزا سے سوال کیا کہ دنیا کی میٹھی شئے کون سی ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ یوں تو دنیا کی سب سے میٹھی اور شیریں چیز محبوبہ کا

پہلا بوسہ ہے۔اس سے میٹھا اور شیریں کچھ نہیں۔ باقی میٹھی چیزیں کھانے سے شوگر کی بیماری لگ سکتی ہے۔ یہ میٹھی چیز شفا بخش ہے۔اس کو چھکنے سے شوگر کے مریض بھی صحت یاب ہوتے ہیں۔ لیکن انتظار میں وہ ذائقہ اور لذت ہے جو پھول کو سونگھنے اور محبوبہ کے پہلے بوسے سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ ہر کام اپنے وقت مقررہ پر پورا ہوتا ہے۔ بچہ وقت مقررہ پر جوان اور جوان ایک طے شدہ مدت کے بعد بوڑھا ہوتا ہے۔انتظار صابر بناتا ہے یہ کسی نعمت سے کم نہیں اور کہتے ہیں رحمتوں اور نعمتوں کے لیے انتظار کرنا پڑتا ہے۔



شفیق بچولیا

بعض لوگوں کا نام ان کی پہچان کے ساتھ ساتھ ان کے پیشے اور کام کی ترجمانی کرتا ہے۔ کسی کا نام اگر جمال قہوہ ہے تو ظاہر ہے وہ قہوہ بنانے کا ماہر ہوگا یا پینے کا شوقین۔ ہمارے آس پاس ہی نہیں آپ کے گاؤں شہر، علاقے میں بھی ایسے افراد ضرور ہوں گے جن کے نام کے ساتھ ان کا پیشہ لگا ہے جیسے ماسٹر غلام الدین۔ کسی آدم زاد میں انکار کی جرات نہیں کہ وہ یہ گستاخی کر سکے کہ ماسٹر غلام الدین ماسٹر نہیں۔ اسی طرح ایک شفیق نام کا بچولیا ہے۔ جس کے کروفرم اور کام سے ہی ظاہر ہے کہ وہ علاقے کا اول نمبر کا بچولیا ہے۔ اس لیے کہ وہ سلام علیک کے بعد ہر فرد سے ایک سوال ضرور کرتا ہے کہ شادی ہوئی ہے؟ کوئی انکار میں جواب دے کہ قبلہ ابھی نہیں ہوئی تو فوراً جیب سے چند تصویر بتاں نکال کر سوال دھر دیتا ہے اس سے کرو گے یا یہ ماہ جبین پسند ہے۔ اب اگر کسی نے جواباً کہا کہ ہاں جناب میری شادی ہوگئی ہے، اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ روا رکھتا ہے۔ الٹی جیب سے فوراً کسی شوخ و شنگ کی مورت نکال کر سوال کرتا ہے کہ دوسری کر لو چار تک اختیار ہے۔ باقی اختیارات تو تم سے وقتاً فوقتاً چھین لیے گئے ہیں یہ اختیار تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

نام تو اس کا شفیق الدین بہتانی تھا۔ بہتانی اس لیے کہ محلے، گاؤں، علاقے میں کوئی شخص ایسا نہیں بچا تھا جس پر اس نے کوئی نہ کوئی بہتان نہ لگائی ہو۔ جس کے سر بہتان کا دستار نہ آیا اس کے سر پر تہمتوں کی ٹوپی ضرور پہنائی۔ ہو بہو اپنی شکل پر گیا ہوا تھا۔ اپنے قد سے زیادہ لمبی زبان، قد نے تو کوئی فائدہ نہ پہنچایا تھا لیکن زبان نے اس کی روزی روٹی کا

بندوبست کر رکھا تھا۔ باتوں سے زیادہ اس کے منہ سے قسمیں اور گالیاں نکلتی تھیں۔ بات کرتے وقت آنکھیں تیز تیز گھماتا تھا۔ ہاتھوں کو بھی قرار نہ تھا۔ بات کرتے وقت ہاتھ اس تیزی سے اور مختلف زاویوں سے چلاتا تھا جیسے اورنگ زیب نے دشمنوں پر تلوار چلائی تھی۔ ایک جگہ نہیں بیٹھتا تھا۔ ہر جگہ، ہر راستے، ہر چوراہے پر حاضر رہتا، سپاہی ملک کی رکھوالی پر معمور ہوتے ہیں یہ گھروں کی دیکھ ریکھ کرتا تھا۔ اس کی اجازت کے بغیر گاؤں میں کوئی بچولیا قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ ہر فرد سے پوچھ گچھ اور ہر قدم پر نظر رکھتا تھا۔ سر پر ٹوپی اور ہمیشہ صدری پہن کر رکھتا تھا۔ کہتا تھا کہ ٹوپی پہنے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ لوگ قسم کا اعتبار اور جھوٹ پر اعتماد جلدی کرتے ہیں۔ جس گھر میں چائے پینے جاتا اس گھر کی برائیاں اس کے ہمسائیوں کے گھر جا کر ایسے کرتا تھا جیسے بیوی اپنے شوہر کی برائی کسی نزدیک اور بھروسہ مند سہیلی سے کرتی ہے۔ سب شفقے کہہ کر پکارتے تھے۔ صرف نام شفیق تھا کام تو اس کے سارے بے شفقت اور بے مروتی کے تھے۔ جھوٹ اس کی زبان سے ایسے نکلتا تھا جیسے سنگین اور خطرناک دشمن کی سرحد پر تفنگ سے گولیاں نکلتی ہیں۔ تفنگ سے نکلی ہوئی گولیاں کسی نہ کسی فرد کو زخمی ضرور کرتی ہے اسی طرح اس کے جھوٹ سے بہت سارے مذبوح و مضروب ہوئے۔ اس نے جو بھی رشتہ کیا مشکل سے رشتے کی گاڑی دھکے دے دے کر ایک سال تک چلی، دوسرے سال جس طرح پرانی گاڑی مستری کے رحم و کرم پر ہوتی ہے ویسے ہی اب یہ رشتہ بڑے بزرگوں کے فیصلوں کے رحم و کرم پر ہوتا تھا۔ اس کے بعد گھر میدان رن بن جاتا تھا۔ آسانی سے طلاق ہو جائے تو ٹھیک ورنہ بات عدالت تک پہنچ کر باقی عمر مقدمے کی نظر ہو جاتی تھی۔

لوگ اس کو دیکھ کر ایسے راستہ بدلتے تھے جیسے اچانک پاگل کتے کو دیکھ کر انسان حواس باختہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ اس نے بھی کتے ہی کی طبیعت پائی تھی اور ویسے ہی کچھ حرکتیں کر کے ان اشخاص کے پیچھے لگ جاتا تھا جو فقط اسی کے شر سے بچنے کے لیے خوف سے راستہ بدل چکے تھے۔ جہاں اور جس گھر پر دستک دیتا ان پر گویا عذاب الٰہی نازل ہوتا تھا۔ چرب دار زبان تھی اس پر ملکہ یہ کہ اس کی جھوٹی باتیں سن کر سچ پر یقین کرنے سے شرمندگی ہوتی تھی۔ لڑکا کانا ہو یا اندھا، کبڑا ہو کالا، موٹا ہو، ناٹا ہو، شرابی ہو یا چرسی، فسادی

ہو، جواری ہو، کتنی ہی برائیاں کا مجسمہ کیوں نہ ہو، اپنی زبان سے اس کی اتنی تعریفین کرتا کہ لوگوں کا شوق جذبہ اور اشتیاق اتنا بڑھ جاتا کہ وہ اسے دیکھنے کے لیے بے قرار ہوتے تھے۔ اپنے کذب سے بدصورت کو یوسف ثانی بناتا اور بدسیرت کو ولی اللہ۔ بے روزگار کو برسر روزگار کرنا اوران پڑھ کو معلم بنانا فقط اس کی زبان کا ہی کمال تھا۔ اپنے کذب و دروغ سے فقیر کو بادشاہ اور محتاج کو غنی بنا دیتا تھا۔

اس کا گھر بھی انوکھی حیرت انگیزیوں کا ٹھکانہ تھا۔ چار بھائی تھے بہن کوئی نہ تھی۔ بدزبانی ان کے گھر کی لونڈی تھی چنانچہ سارے بھائی ایک دوسرے کو آپس میں نام کے بجائے سالا کہہ کر پکارتے تھے۔ شفقے کی چار بیٹیاں تھیں جو یک بعد دیگرے اپنے اپنے محبوں کے ساتھ بھاگ گئیں۔ شفقے کو بڑا قلق تھا اور رقت انگیز لہجے میں افسوس کرتا تھا کہ ہائے کم نصیبوں نے بھاگنے سے پہلے مجھ سے اجازت بھی نہ لی۔ مجھ سے اجازت نامہ لے کر بھاگتی تو مجھے قلق نہ ہوتا۔ اکثر کہتا تھا کہ بیٹیاں میری نصیب والی، باپ کی وفادار اور شعور دار تھیں۔ باپ کو تکلیف اذیتوں اور پریشانیوں میں نہیں دیکھنا چاہتی تھی اس لیے اپنا اپنا بندوبست خود کیا۔ جہیز اور مناسب گھر ڈھونڈنا پریشانی اور اذیت ہی تو ہے۔ بیٹے کا خدا جانے کیا نام تھا وہ جب بھی بیٹے کو پکارتا تھا ایک بہودہ اور ننگی ماں کی گالی دے کر پکارتا تھا۔ ہمیشہ بھائی کے مرنے کی دعا مانگتا تھا تاکہ اس کی بیوہ سے نکاح کر سکے۔ اکثر کہتا تھا کہ خدا مجھے وہ زمانہ دکھائے کہ صرف دنیا میں زنانہ ہی زنانہ نظر آئے اور میرے سوا کوئی مرد نظر نہ آئے۔ اس کی خواہش تھی کہ کرشن کی طرح اس کے اردگرد بھی گوپیاں اور بس گوپیاں رہے۔

شفقے کا کام لڑکوں سے شادی کی بات کرنا تھا۔ یہ تخصیص نہیں تھی کہ لڑکا بالغ ہے یا کم سن۔ جس لڑکے سے ایک بار بھی بات کی اس کو برباد کرنے تک اس کا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ اس کی پیش کش کو ٹھکرانے کا اختیار کسی کو نہ تھا۔ کسی نے جرات کا مظاہرہ کر کے اس کی بات رد کی تو ہر محفل میں اس کی وہ وہ برائیاں کرتا تھا کہ موجودات عالم اس کو دیکھ کر شک وشبہ میں پڑ جاتی تھی۔ جہاں جسارت کرنے والا انکاری نظر آتا تھا اس کو یہ طعنہ ضرور دیتا کہ تم نے نخرے نہ کئے ہوتے تو تمہارا ایک خوبصورت آشیانہ ہوتا اور قوی امکان ہے کہ صاحب اولاد بھی

ہوئے ہوتے۔ہٹلر نے یہودیوں پر اتنے مظالم نہیں ڈھائے جتنے اس نے نوجوانوں اور سچ پر ڈھائے۔ جھوٹ بڑا میٹھا ہوتا ہے اور حسین خواب اور خوبصورت باغ دکھاتا ہے۔لوگ جھوٹ سننے کے عادی ہو جائے تو سچ ان کو کڑوا زہر لگتا ہے۔اس کے جھوٹ سے لوگ سچ سے بیزار اور شادی سے متنفر ہوئے تھے۔اس شخص پر اللہ کا خاص فضل ہے جو شفیق بچولے کو نہیں جانتا۔کسی بندے سے خدا شدید ناراض ہو جائے تو اس کا سامنا اور واسطہ اس سے پڑتا ہے۔ ہر اس شخص کو خدا کا شکر بجالانا چاہیے جو اس سے نہیں ملا۔اس کے شر سے انسان کو اس کی موت ہی بچا سکتی ہے، باقی کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ اس کے جھوٹ اور بہتان کو برداشت کر کے زندہ رہ سکے۔خدا بچائے بری اور خطرناک بلاؤں سے جن میں ایک شفیق بچولیا ہے۔کنوارے ہی اس سے خائف نہیں بلکہ شادی شدہ حضرات کی بیویاں بھی اس سے تنگ ہیں۔ان کو ڈر ہے کہ کئی ان کے شوہروں کو ورغلا کر دوسری شادی کرنے پر تیار نہ کردے۔وہ اسے ہر وقت کوستی رہتی ہیں شاید ان کے کوسنے اور بددعاؤں سے شفیق اللہ کو پیارا ہو جائے۔



ذکر عہد شباب

انسان کو بچپن کے سہانے دن اور عہد شباب بہت زیادہ یاد آتا ہے۔ عہد شباب شتاب گزر جاتا ہے لیکن وہ دور حسین لمحات سے مزین ہوتا ہے۔ پیری میں پہنچ کر ان ہی حسین وجمیل لمحات کو یاد کر کے بڑے بوڑھے پل پل گزارتے ہیں اور آہیں بھرتے ہیں۔ اگر بوڑھاپے میں ان کے پاس یہ سرمایہ بھی نہ ہوتو ان کے لیے جینا دشوار اور سانس لینا ناگوار ہو جائے۔ جو قصے مزے لے لے بیان کئے جاتے ہیں وہ بچپن اور جوانی کے ہی ہوتے ہیں۔ دور شباب آرزؤں، امنگوں، ترنگوں، رنگینی، جوش، جذبے اور ولولوں کا دور ہوتا ہے۔ اس دور میں ہر فرد کی کہانی بنتی ہے جس کو وہ بڑے چاؤ سے دوسروں کو سناتا ہے۔ اس عمر میں اگر کسی کی کوئی کہانی نہ بھی بنے پھر بھی وہ حسین لمحات کو یاد کر کے خود کو تسلی دیتا رہتا ہے کہ کبھی میرا بھی شمار حسین وجمیل اور خوبصورت لوگوں میں ہوتا تھا۔ ہر شخص عہد شباب کو بڑی حسرتوں، چاؤ اور ارمانوں سمیت یاد کرتا ہے کیونکہ یہ دور ہی یادگار اور شاندار ہوتا ہے۔ اس دور میں خواب، ارمان، ولولے اور کامیاب ہونے کے حوصلے زیادہ ہوتے ہیں اور ناکام ونامراد ہونے کا خوف کم ہوتا ہے۔ اس عمر میں پیار کی مہک اور عشق کی خوشبو سے بدن مہکتا اور دل شاد وآباد رہتا ہے۔ اس دور کی ہر رات سہانی اور ہر دن خوشگوار ہوتا ہے۔ عہد شباب میں ہر چیز شیریں اور میٹھی لگتی ہے۔ مرزا سے جب کسی نے سوال کیا کہ قبلہ دنیا کی سب سے میٹھی اور شیریں چیز کون سی ہے۔ مرزا نے بڑے سوچ بچار کے بعد جواب دیا کہ دنیا کی سب سے میٹھی اور شیرین چیز عہد شباب کی محبوبہ کا پہلا بوسہ ہے۔ اس سے میٹھا اور

شیرین کچھ نہیں۔ بعض میٹھی چیزیں کھانے سے شوگر کی بیماری لگ سکتی ہے۔ یہ میٹھی چیز شفا بخش ہے۔ اس کو چھکنے سے شوگر کے مریض بھی صحت یاب ہوتے ہیں۔

انسان کو بچھڑے محبوب کی یاد، بچپن کے دن اور شباب کا دور بہت یاد آتا ہے۔ اسے گزرہوئے دن اور عہد شباب کے وہ حسین لمحات للچاتے، تڑپاتے اور ترساتے رہتے ہیں۔ عام بات ہے کہ ہر شخص کا بچپن حسین اور جوانی رنگین ہوتی ہے۔ عہد شباب میں کوئی حسرت ادھوری رہ جائے تو عمر بھر اس کا قلق رہتا ہے۔ کسی شخص کا دور شباب پارسائی اور نیکی میں گزرے تو یہ جوانی کی توہین اور عہد شباب کی بے عزتی ہے۔ شباب میں اکثر انسان بہک جاتا ہے اور اس دور میں گناہ کی لذت ثواب کا کام دیتی ہے۔ اس عمر میں عشق عاشقی کو پر لگ جاتے ہیں۔ یہی عمر ہے جس میں مجنون کی تقلید اور فرہاد کی پیروی کی جاتی ہے۔ اس عمر میں خوش شکل، خوش رو، موہنی صورت، من موہنی مورت اور خوش اندام کے خواب آنا خلاف عادت نہیں۔ اس عمر میں لڑکی کی کشش اپنے طرف ایسے مائل کرتی ہے جیسے پروانے کو شمع اور بھنورے کو پھول کی کشش اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس دور میں محبت کے گیت گانا اور عشق کے راگ الاپنا محبوب مشغلہ بن جاتا ہے۔ بعض اسی عمر میں بے قابو ہو کر شادی جیسا سنگین فیصلہ کر بیٹھتے ہیں۔ ایسے افراد بیوی کے طعنوں سے خوشی محسوس کرتے ہیں اور بدزبانی کا لطف لے رہے ہوتے ہیں۔ بعض شادی سے دور رہ کر محبوب کی زلفوں کے اسیر ہو کر اسی سائے میں پروان چڑھ رہے ہوتے ہیں۔ اس عمر میں کوئل سے سریلی آواز محبوب کی لگتی ہے۔ ہر نغمے سے میٹھی اور کانوں میں رس گھولنے والی بھی محبوب اور بس محبوب کی آواز ہی ہوتی ہے۔ شادی شدہ اور کنوارے انسان کی پسند الگ الگ ہوتی ہے۔ کسی کو محبوب کی یاد پسند ہوتی ہے تو کوئی محبوبہ کی یادوں کو پسند کرتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ اگر کسی لڑکے کو کسی لڑکی کی باتیں شیکسپیر کے مکالموں سے اچھی، میر کی شاعری سے بہتر، غالب کے اشعار سے خوب تر اور فراز کی غزلوں سے بھلی لگتی ہیں تو سمجھ جاؤ کہ اسے اس لڑکی سے شدت والی محبت ہوگئی ہے۔ جس شخص کو فیض، جوش اور حبیب جالب کی شاعری اچھی لگتی ہے یہ اشارہ ہے کہ وہ شادی شدہ ہوگا اور ان شعراء کو پسند فرمانے کے پیچھے یہ مقصد ہے کہ ایسا بندہ انقلاب، بدلاؤ اور تغیر و تبدل کا منتظر ہے۔

عہد شباب میں کمانے سے زیادہ خرچ کرنے کا چسکا ہوتا ہے۔اس عمر میں نوجوانوں کو پیسے کی قدر اور خرچ کرنے کے سلیقوں اور طریقوں کا علم ہی نہیں ہوتا۔ بڑے بوڑھے کی نصیحت ان پر ویسے ہی اثر نہیں کرتی جیسے کسی بزدل کے سامنے بہادری کے قصے اور کہانیاں سنائی جائیں اور وہ پھر بھی دبک کر رہے۔ ان میں پیسے کی چاہت کو بیدار کرنے، اس کی اہمیت وافادیت کو سمجھانے اور فضول خرچی سے بچانے کا واحد حل مرزا یہ بتاتے ہیں کہ جو عہد شباب میں خام دست، فضول خرچ اور لٹاؤ ہوگا اس کو وہ نوٹ خرچ کرنے کے لیے دیئے جائیں جن پر گاندھی جی کے بجائے اس کی پسند کی گل اندام، نازنینوں اور حسیناؤں کی تصویریں ہوں۔فضول خرچی کرنے کا مرض ٹھیک ہو جائے گا اور وہ ان نوٹوں کو خرچ کرنے کے بجائے سینے سے لگائے رکھے گا۔

عہد شباب میں بعض چیزین پسند ہوتی ہیں تو بعض ناپسند۔انسان خواہش کرتا ہے کہ اس کی پسند کی چیزیں اس کے سامنے رہے تاکہ اس کو سکون اور مسرت حاصل ہوتی رہے۔جس طرح شباب کی واضح علامات ہیں اسی طرح ہر فرد میں طاقت کی کوئی علامت اور کمزوری کی کوئی نشانی ہوتی ہے۔کوئی اگر بہادر اور جری ہے تو یقیناً اس کی بہادری اور شجاعت کے پیچھے کوئی خاص وجہ ہوگی۔ٹھیک اسی طرح اگر کوئی کمزور اور ناتواں ہے تو اس کی کمزوری اور ضعیفی کے پیچھے بھی کوئی خاص علت ہوگی۔مرزا سے جب عہد شباب کی کمزوریوں کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے کہا کہ جوانی میں جو سکون، انبساط اور فرحت مجھے اچھی کتاب پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے ویسا ہی قرار میسر آتا ہے جب میں کسی کی خوبصورت آنکھوں کو دیکھتا ہوں۔ میری ازل سے کل ملا کر دو ہی کمزوریاں رہی ہیں اچھی کتاب اور خوبصورت آنکھیں۔

بعض فتنہ پرور دوست مجھ سے میرے شباب کے بارے میں کرید کرید کر پوچھتے ہیں۔ان فسادیوں سے خود کو بچانے کے لیے عرض ہے کہ میرا بھی عہد شباب ویسا ہی گزرا جیسے مجنوں اور فرہاد کا گزرا تھا یعنی دیوانگی اور جنوں میں۔ان میں اور مجھ میں بس ایک فرق ہے ان کا نام تاریخ میں درج ہے میں ان گمنام عاشقوں میں ہوں جنھوں نے محبوبہ کی شادی کے بعد دل پر تالا نہیں لگایا بلکہ تو نہیں اور سہی اور سہی اور سہی کا ورد کرتا رہا لیکن وہ اور سہی ابھی تک نہ میسر آیا نہ ہی مقدر میں۔جس نے مجھ پر عشق کا سایہ کیا اور میرے دل کو پارہ پارہ کیا اس

کی بس آنکھیں ہی خوبصورت تھیں، زبان سے ہمیشہ انگارے ہی نکلتے تھے۔شروع شروع میں محبت کے نشے میں ہر چیز خوبصورت نظر آتی ہے یہاں تک کہ بدزبان محبوبہ بھی شیریں کی شیرینی کو پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔میرا محبوب معصوم تھا اور گمان تھا کہ وہ شریف ہی ہوگا لیکن خواب تب ریزہ ریزہ ہوئے جب اس نے معمولی معمولی باتوں پر جھگڑا شروع کر دیا اور گالیوں سے خاطر تواضع کی تو میری سمجھ میں آیا کہ دنیا میں شریفوں کے انتخاب میں پہلا نمبر میرا ہی ہے۔ اول اول تو محبوبہ کے منہ سے نکلی گالی، گالی نہیں تعریف لگتی ہے۔مرزا کہتے ہیں کہ محبوبہ کے منہ سے جو اپنائیت سے بے تکلف گالی نکلتی ہے وہ تعریفوں سے دوگنا مزہ دیتی ہے۔

یہ ہرگز نہیں کہنا چاہیے کہ شباب صرف عشق عاشقی کے لیے ہی ہے۔ہاں اتنا ہے کہ اس کے بغیر عہد شباب کا ذکر کرنا فضول ہی لگتا ہے۔جس نے اس عمر میں کسی کی زلفوں کے نیچے شام نہ کی، باتیں اور ملاقاتیں نہ کیں، روٹھ کر منانا اور منانے کے بعد روٹھنے کے کھیل نہ کھیلے، باغ میں پھول کے سنگ مختلف رنگ ڈھنگ نہ دیکھے، ہجر کے دوہے اور وصال کے نغمے نہ گائے، قربت کو محسوس نہ کیا اور دوری سے تن نہ جلایا، دل پر چوٹ نہ کھائی، خود کو رسوا اور بدنام نہ کیا، مست آنکھوں کے جام نہ دیکھے، ہجر کے دن نہ کاٹے، وصال کی طلب نہ کی اور جدائی سے کروٹیں نہ لیں اس کی جوانی بیان کرنے کے لائق نہیں۔مرزا کہتے ہیں کہ وہ عہد شباب بے رنگ ہے جس پر محبوب کا عذاب اور عتاب نازل نہ ہوا ہو۔

مرزا سے جب اس کے عہد شباب کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا کہ ہر بالغ کی طرح میری بھی جوانی بھی بڑی رنگین گزری۔مرزا اپنی جوانی کے قصے ہر اس محفل میں بیان کرتے ہیں جہاں چار آدمی جمع ہوں، حتیٰ کہ کسی تعزیتی مجلس میں بھی مرزا اپنے عہد شباب کا تذکرہ چھیڑنے سے نہیں چوکتے۔بعض لونڈے جان بوجھ کر مرزا سے اس کے قصے سنتے اور ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ان نوجوان نے مرزا سے سوال کیا کہ جوانی میں آپ کو کیسی لڑکیاں پسند آتی تھیں۔مرزا نے دھیمے لہجے میں بتایا کہ نوعمری سے ہی میری بس ایک کمزوری رہی ہے کہ میں اس لڑکی پر فریفتہ ہوتا ہوں جو خوش اخلاق ہو، پر خدا گواہ ہے کہ فدا تو میں ہمیشہ خوبصورت آنکھوں والی پر ہی ہوا ہوں۔میں قتل ہونے کے لیے تیار

ہوں اگر اچھے اخلاق والی لڑکی کے ہاتھ میں تلوار دی جائے تا کہ وہ مجھے بڑے اخلاق اور اداؤں سے گھائل کردے۔میں سو بار مرنے کے لیے تیار ہوں اگر خوبصورت آنکھوں والیاں مجھے اپنی خوبصورت آنکھوں کے تیر سے نشانہ بنائے۔یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اچھے اخلاق والے تلوار نہیں اٹھاتے بلکہ اپنے اخلاق حسنہ سے ہی زیر کرتے ہیں اور خوبصورت آنکھوں کے تیر سے گھائل ہونے والا نہ مرتا ہے نہ بچتا ہے بس تڑپتا اور ترستا ہی ہے۔

عہد شباب میں انسان بنتا اور بگڑتا ہے۔اس عہد میں مقصد سے زیادہ ارمان اہم ہوتے ہیں اس لیے اس عمر میں بنتے ہی ہے بنتے نہیں ہے۔یہ وہ دور ہوتا ہے جس میں انسان کی سوچنے سمجھنے دیکھنے، پرکھنے کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ سب دیکھ اور سمجھ سکتا ہے جو آنے والی زندگی کے لیے سودمند رہتا ہے۔اس دور میں سیدھی راہ ڈھونڈنا اور اس پر چلنا کمال ہے۔ایسے کمالات کم قلیل جیالے کرتے ہیں جن کا نام تاقیامت روشن رہتا ہے۔ عہد شباب میں گلاب کی طرح مہک کر اپنی خوشبو پھیلانا اور دلوں میں گھر کرنا بہت مشکل ہے اور مشکل کام کرنے سے ہی انسان شناخت بنا پاتا ہے۔اس کا ہر لمحہ اور پل پل قیمتی ہوتا ہے۔جو پل زندگی کا سرمایہ ہوں وہ انمول ہوتے ہیں اور عہد شباب کا دور انمول اور گراں بہا ہوتا ہے۔عہد شباب کیسا ہی رہا ہو جب بھی کوئی اس کا ذکر کرتا ہے تو آنکھوں میں چمک، لہجے میں جوش اور ولولہ آجاتا ہے۔ایسے کام جن کی وجہ سے رہتی دنیا تک نام رہتا ہے اسی عمر میں کئے جاتے ہیں۔کسی بھی شے پر بچپن، جوانی اور بوڑھاپے کا دور ضرور آتا ہے۔جس کا بچپن بے فکری میں گزر جائے ، جوانی حوصلوں، سہانی یادوں، اچھے کاموں اور کارناموں، عہد شباب سنہری یادوں اور دلچسپ مشغلوں میں، اس کا بڑھاپا بڑا سہانا اس لحاظ سے ہوتا ہے کہ وہ عہد شباب کو یاد کر کے مسرت وانبساط حاصل کرتا ہے اور شادماں رہتا ہے۔مرزا کہتے ہیں کہ جوانی میں ایسے ہی کام کرنے چاہیے جن کو یاد کر کے اذیت اور پشیمانی نہ ہو بلکہ فخر اور فرحت محسوس ہو۔جوانی میں وہ کارنامے انجام دینے چاہیے جو لائق بیان اور قابل سماعت ہوں۔ایسے کارنامے جوانی میں انجام ہی نہیں دینے چاہیے جو بے عزتی اور اذیت کا سبب بنے۔مرزا کہتے ہیں کہ خواب اور کباب عہد شباب میں سجتے ہیں۔ ☆☆

مرزا اتباک آبادی

مرزا اتباک آبادی کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے نہ صرف شاعری کی شمع کو روشن کیا بلکہ عمر بھر شمعیں ان کے اردگرد اور یہ شمعوں کے اردگرد گھومتے پھرتے رہے۔ انہوں نے شاعری کی شروعات کب سے کی کچھ وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہاں یقین کے ساتھ اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ جب سے پیدا ہوئے تب ہی سے قلم کی علم کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھر رہے ہیں۔ بڑے نامور نقاد دوعالم غیبی جو مرزا اتباک آبادی کے بچپن کے دوست اور قریبی رشتہ دار بھی ہیں نے ان کی حیات، کارناموں اور شاعری پر تحقیقی کام کرنے کے بعد بڑی جانفشانی اور محنت سے اس معتبر رائے کا اظہار کیا ہے کہ مرزا صاحب پیدائشی شاعر ہیں۔ انہوں نے پیدا ہوتے ہی اپنا پہلا شعر دائی کی آنکھوں کو دیکھ کر کہا تھا۔ غیبی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ یہ بات بھی دور از قیاس نہیں کہ انہوں نے اس کی زلفوں کو دیکھ کر یہ پوری غزل مکمل کی ہوگی۔ دوعالم غیبی صاحب کی یہ رائے اس کے اثر ورسوخ اور دبدبے کی وجہ سے ادبی حلقوں میں بڑی معتبر مانی جاتی ہے۔ غیبی صاحب نے جو کتاب مرزا صاحب پر لکھی ہے وہ حوالہ بن گئی ہے اور نئے لکھاری اور قلمکار فقط اس کتاب کے مطالعے سے ہی مرزا صاحب کی تار نفس، حیات وخدمات، انفرادیت اور شاعری کے بارے میں واقفیت اور اہم معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ مرزا اتباک آبادی جس طرح بڑی سبک روی اور سنجیدگی سے حسن اور حسینوں کی تعریف کرتے ہیں اس سے چوگنی رفتار سے ان کے لب ورخسار، آنکھوں، زلفوں اور موہوم کمر کو دیکھ کر شعر کہتے ہیں۔ جس طرح ایک میان میں دو تلواریں

نہیں رہ سکتی اسی طرح مرزا صاحب کے اشعار میں معنی اور وزن ایک ساتھ نہیں دیکھے جاسکتے۔ سامعین کو خوش کرنا ہو تو معنی پر ضرور دیتے ہیں، اگر کسی عروض دان کو خوش کرنا ہو تو عروض پہ زور دیتے ہیں۔ ان کے زور دینے کا مزاج بدلتا رہتا ہے۔ کب کس چیز پر زور دے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ان کے اکثر اشعار بحر سے خارج ہی نہیں ہوتے بلکہ تمیز، تہذیب اور اخلاق سے بھی گرے ہوتے ہیں۔ ان کو بھولنے کی بیماری ہے۔ کبھی شعر میں وزن ڈالنا بھول جاتے ہیں تو کبھی معنی و مطلب۔ مرزا صاحب ہر وہ مشاعرہ لوٹ لیتے ہیں جس میں وہ نہیں بلائے جاتے۔ پچھلے کئی سالوں سے وہ ہر ادبی ایوارڈ بڑے ادب سے خرید کر اپنے نام کرتے ہیں اور اس پر دو تین دن تک چلنے والے جشن کا انتظام کرتے ہیں۔ اس جشن میں ان کے وہ دوست شامل ہوتے ہیں جو ان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا چکے ہوں۔ ادب ان کا اوڑھنا بچھونا اور بسترہ ہی نہیں بلکہ کمبل اور تکیہ بھی بن گیا ہے۔ غیبی صاحب نے ان کی شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مرزا صاحب کو ہم ادب سے جدا کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ مرزا صاحب ادب کے لیے بنے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں، ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ہم نے مرزا صاحب کو ادب سے جدا کرنے کی کوشش بھی کی تو ان کا دم گھٹ سکتا ہے۔ ان کی لمبی عمر کے لیے ہمیں ان کے ہر مصرعے اور ہر جملے پر نہ صرف داد دینی ہوگی بلکہ اس پر تعریفوں کی بارش کرنی ہوگی ورنہ ہم ایک لائق و فائق شاعر، ادیب، تنقید نگار کو کھودیں گے۔ یہ سچ بھی ہے کہ اگر مرزا صاحب کو ادب سے جدا کیا گیا تو ان کے پاس ان کی بے ادب زندگی کے سوا کچھ نہ رہے گا۔ مرزا تباک آبادی صاحب جتنے تپاک سے شاعری کرتے ہیں وہ اتنی ہی گرم جوشی سے نثر بھی لکھتے ہیں۔ شاعری میں ان کا خاص میدان تو غزل ہی ہے جس میں وہ اپنے جوہر دکھاتے ہیں لیکن اپنے کمالات قصیدہ، جو کہ وہ اپنے دوستوں کی شان میں لکھتے ہیں، مرثیے، جو کہ عزیزوں کے مرنے پر لکھتے ہیں، ہجویہ قصیدے، جن میں اپنے ان مخالفین و معاصرین کی مٹی پلید کرتے ہیں جو اس کو بڑا شاعر اور نثر نگار ماننے سے انکار کرتے ہیں، شہر آشوب، جن میں شہر کے اجڑنے کا نقشہ کھینچتے ہیں وغیرہ میں دکھاتے ہیں۔ نثر میں تعارفی مضامین سے لے کر خوشامدی

تبصروں تک ، جانب داری سے کام لے کر دوستوں پر لکھے تنقیدی مضامین تک ، اپنے اوپر لکھے گئے مضامین جو کہ وہ بعض دفعہ خود لکھتے ہیں سے لے کر اس واہ واہ تک جوان کی شاعری کو سن کر ان کے دوست کرتے ہیں ، اپنے جوہر دکھا چکے ہیں ۔ ان کا اونچا ، بلند اور لمبا ادبی قد دیکھنا ہو تو ان اخبارات کی ورق گردانی کرنی پڑے گی جو وہ خود نکالتے ہیں اور جن میں اس کے بقلم خود لکھے ہوئے تعریفی و تعارفی مضامین روز ہی شائع ہوتے ہیں ۔ ہر سال کوئی نہ کوئی ادبی ایوارڈ خریدتے ہیں اور خریدنے کے بعد لوگوں کی پرزور دعوت کرتے ہیں اور خود کی پذیرائی کرانی میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتے ۔ حضرت کے متعلق بہت سارے ناقدین دوستوں نے اظہار خیال کیا اور اس کو شاعر مشرق و مغرب قرار دیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ اگر انہوں نے یوں ہی شاعری جاری رکھی تو وہ دن دور نہیں جب میر ، غالب اور اقبال کی ساکھ اور عظمت کو خطرہ لاحق ہوگا ۔ بعض دوستوں نے تو میر و غالب سے بڑا شاعر اور حالی اور شبلی سے بڑا تنقید نگار اور نثر نگار ان ہی کو مانا ہے ۔

مرزا تباک آبادی صاحب نے بہت سارے موضوعات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا جن میں مچھر کی بھنبناہٹ سے لے کر مکھی کے اڑنے تک ، بارش کے برسنے سے لے کر برف کے پگھلنے تک ، ٹانگہ چلنے سے لے کر گھوڑے کی ٹاپ کی آواز تک اور مرغے کی بانگ سے لے کر بکری کی میں میں تک کو بڑی فنکاری اور چابکدستی سے اپنی شاعری میں سمویا ہے ۔ وہ اپنی شاعری میں بلی کی میاؤں میاؤں ، گائے کی جگالی اور دودھ کی سفیدی کے علاوہ صابن کا استعمال ، برتنوں کا دھونا ، جیسے موضوعات کو بھی اپنی شعری کائنات میں بڑی چالاکی اور کمال فن کے ساتھ برتتے ہیں ۔ ان کی دو چار عدد نظمیں کھانا کھانے اور پکانے کی ترکیبیں اور بچوں کو کیسے دودھ پلایا جائے جیسے موضوعات پر بھی ہیں ۔ ان کی نظمیں اور غزلیں نہ صرف عوام میں مقبولیت حاصل کر چکی ہیں بلکہ طبقہ خاص میں بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں ۔ تباک آبادی صاحب نہ صرف مشاعروں کی صدارت کرتے ہیں بلکہ اپنی شان میں خود ہی مشاعرے منعقد کراتے ہیں ۔ ان مشاعروں میں شاعری پر کم اور کھانے پینے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے ۔ انہوں نے یہ اصول اپنا رکھا ہے کہ عورت کو خوش کرنا ہو تو اس کی

خوب تعریفیں کرواور اگر مردوں کا دل جیتنا ہوتو انہیں اچھا کھانا کھلاؤ۔

مرزا اتباک آبادی کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آ کر داد تحسین وصول کر چکے ہیں۔ان کے اب تک تین شعری مجموعے پچھر کا کاٹا،مکھی اور مچھر، کیڑے مکوڑے منظر عام پر آ چکے ہیں۔امید کی جاسکتی ہے کہ ان کے اثر ورسوخ کی بدولت انہیں ہر وہ ادبی ایوارڈ دیا جائے گا جو دنیا بھر کے ان ادیبوں اور شاعروں کو دیا جاتا ہے جنہوں نے کوئی خاص ادبی کارنامہ انجام دیا ہو۔جلد ہی اس کے نام کی یونیورسٹی اور اتباک ایوارڈ بھی قائم کیا جائے گا تا کہ اثر ورسوخ رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کو نہ لکھنے میں دقت رہے اور نہ ہی ایوارڈ حاصل کرنے میں۔ان کی تنقیدی کتب میں ان کے عزیز دوست ڈاکٹر بخار کشمیری کی شاعری، زکام زبیری بحثیت اقبال شناس اور بلغم مراد پوری کی شاعری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی کتاب ڈاکٹر بخار کاشمیری کی شاعری پر انہیں اکادمی نے ایوارڈ سے بھی نوازا ہے۔ مرزا اتباک آبادی پر اکثر سیمینار اور کانفرنسیں رات کے اندھیری میں منعقد ہوتی ہیں اور دن کے اجالے میں وہ نمایاں خبریں اخبارات کی زینت بن کر پھیلائی جاتی ہیں۔ان کی ہر بات بہت جلدی پھیل جاتی ہے گویا ایسا لگتا ہے کہ ریڈیو، اخبار اور بعض سوشل سائٹس صرف ان کے اشتہارات کو مشتہر کرنے کے لیے رہ گئی ہیں۔اب ادبی دنیا سے وابستہ لوگ ان کے مرنے کا انتظار کر رہے ہیں تا کہ ان پر مزید تحقیقی کام ہو سکے۔



شادی شدہ اور کنوارے

ہمارے ہاں جو عمل بیک وقت مقبول اور بدنام ہے وہ شادی ہے۔ جو اس پل صراط کے پار گیا جنت پائی اور جو ابھی پار کرنے کا سوچ رہا ہے وہ بھی جنت میں ہی ہے۔ شادی شدہ افراد شادی کرنے کے بعد اتنے خوش ہوتے ہیں جتنے کنوارے شادی سے پہلے ہوتے ہیں۔ قدیم زمانے سے یہ بحث چلی آرہی ہے کہ شادی شدہ بہتر ہے یا کنوارا۔ ابھی یہ فیصلہ نہیں ہو پایا کہ کس کو فاتح قرار دیا جائے، کون خسارے میں اور کون فائدے میں ہے۔ دونوں فریقین کی زندگی کا مطالعہ کیا گیا، نتائج حیران کن ہی نہیں بلکہ پریشان کن نکلے۔ اتنا ہی نہیں دونوں سے رائے لی گئی کہ بہترین زندگی کنواروں کی ہے یا شادی شدگان کی لیکن کسی کی رائے پر کلی طور پر اتفاق نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بعض حضرات شادی کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے اور اسے برا سمجھ کر اس برائی کے مرتکب ہوجاتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو دو دو تین تین مرتبہ اس مہم کو سر کرتے ہیں لیکن کنواروں کو نصیحت کررہے ہوتے ہیں کہ شادی مت کرنا۔ گویا وہ کنواروں کو بے وقوف، احمق اور پاگل سمجھتے ہیں۔ خود قلعے کو فتح کرنے کے بعد یہ مشورہ دینا کہ جنگ مت کرنا دوسرے کو بے وقوف ہی سمجھنے کے مترادف ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ آج کل جھوٹ کا چلن عام ہے کسی پر بھی بھروسہ آسانی سے نہیں کرنا چاہیے اگر کوئی کہہ دے کہ زہر سے انسان مرجاتا ہے تو بھروسہ نہیں کرنا چاہیے خود کھا کر دیکھ لینا چاہیے۔

جو غیر شادی شدہ ہیں اس کا مطلب وہ آزاد اور کنوارے ہیں۔ کنوارا احمق، بے وقوف اور ناتجربہ کار رہتا ہے کیونکہ اس نے شادی کے فوائد، بیوی کی ناراضگی، روٹھنا

منایا، تلخیاں اور طنز یہ لہجہ نہیں دیکھا ہوتا۔شادی کی عمر ہو جائے تو جان بوجھ کر کنوارا رہنے والے کو لوگ بیمار اور پاگل سمجھتے ہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ یہ ہرگز درست نہیں کہ کنوارا پاگل ہے مطمئن، خوش اور ہشاش باش شخص پاگل نہیں ہو سکتا۔ پاگل ہونے کے لیے شادی شدہ ہونا ضروری ہے۔کوئی میزان ایسی نہیں بنی جو یہ تخمینہ لگا سکے کہ کنوارا خوش ہوتا ہے یا شادی شدہ۔ کچھ لمحات دونوں کی زندگی میں ایسے ہوتے ہیں جب یہ دونوں خوش ہوتے ہیں اور کچھ پل ایسے ہوتے ہیں جو بیوی کے ساتھ گزار کر انسان فرحت محسوس کرتا ہے۔شادی شدہ بندے کی زبان پر ایک نصیحت ہمیشہ ہوتی ہے اور اس کا پرچار وہ جہاں موقع ملے کر لیتا ہے کہ شادی نہیں کرنا۔لیکن خود اس پر وہ عمل نہیں کرتا۔ایسے شخص پر کم سے کم ہمیں تو بھروسہ نہیں کہ جس کے منہ میں سگریٹ ہو اور وہ اس کی برائیاں بھی کر رہا ہو کہ اس سے صحت خراب ہوتی ہے۔ کنوارا بادشاہ ہوتا ہے اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ شادی شدہ غلام ہوتا ہے۔مرزا سے پوچھا گیا کہ بادشاہ اور غلام میں کیا فرق ہے قربان جاؤں اس کی ذہانت و فطانت پر اس نے تاریخی جملہ کہا کہ جو فرق کنوارے اور شادی شدہ میں ہوتا ہے۔دوہی زمانے بادشاہی اور بے فکری کے ہوتے ہیں بچپن اور جوانی کے وہ دن جو کنوارے گزرے ہوں۔شادی کے بعد میاں بیوی میں ان بن ہو جائے تو طلاق کی نوبت آتی ہے جو رسوائی اور بدنامی کا سبب بنتا ہے۔کنوارے کو رسوائی کا غم ہے نہ بدنام کا خوف وہ شادی کرے تو کھٹکا لگے ورنہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔۔۔!

بندہ کنوارا مر جائے تو قوی امکان ہے کہ جنت میں جائے کیونکہ وہ اپنی ماں کو زبان درازی، واہیات خیالات اور ان گالیوں سے بچاتا ہے جو وہ دوران ساس بہو کی مہابھارت کے موقع پر اپنی بہو کو دینے جارہی تھی۔اتنا ہی نہیں وہ ماں کے تقدس اور مرتبہ کو بھی پامال ہونے سے بچاتا ہے نہ وہ شادی کرتا ہے اور نہ ہی وہ آفت گھر میں آتی ہے جو اس کی ماں کو گالیاں دیتی، کوستی، ناروا سلوک کرتی اور لان تان کرتی ہے۔گویا وہ ماں اور بیوی دونوں کو مغلظات اور بدزبانی سے بچاتا ہے۔نہ بیوی کی طرف داری کرتا ہے نہ ماں کی پاسداری۔بیوی کے جذبات کو ٹھیس نہیں لگتی اور ماں کا احساس بھی برقرار رہتا ہے کہ میں نے

انسان ہی جنا تھا اور یہ انسان ہی نکلا۔ مرزا کہتے ہیں کہ گناہ کا بوجھ جتنا کم ہوا تنا انسان ہلکا اور صاف و پاک ہوتا ہے اور گناہوں سے پاک انسان جنت میں ضرور داخل ہوگا۔

سائنس اور بیوی میں بڑی مماثلتیں ہیں دونوں نئی نئی چیزوں کی کھوج اور جستجو میں سرگرداں رہتے ہیں۔ سائنس سے بڑی تحقیق بیوی کی تحقیق ہوتی ہے جس میں لاگت کم آتی ہے لیکن وہ دریافت سامنے آتی ہے جو سائنس کے حد کمال سے باہر ہے۔ بیوی شوہر کے کارناموں کی کھوج میں لگ جائے تو روز نئی ایجادات سامنے آتی ہیں۔ سائنس کی تحقیق میں کمیاں اور خامیاں ہوسکتی ہے بیوی کی تحقیق میں نہیں۔ جہاں سائنس کی نظر نہیں جاتی وہاں بیوی اور ساس کی نظر جاتی ہے۔ اس تحقیق سے صرف ایک ہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے وہ ہے کنوارا۔ مرزا کہتے ہیں بیوی کی مار اور زبان کے وار سے صرف ایک مخلوق بچی رہتی ہے وہ ہیں کنوارے۔ شادی شدہ پر بیوی ایسی نظر رکھتی ہے جیسے سرحد پر فوج دشمن کی ہر حرکت اور عمل پر نظر رکھتی ہے۔

کنوارے سے خوش قسمت شخص کوئی نہیں کہ اسے نہ بیوی کی فرمائشیں پوری کرنی پڑتی ہے نا ہی بچوں کی مانگیں۔ یہ دونوں سے آزاد اور بے نیاز ہوتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ بیوی اور شیطان کبھی راضی نہیں ہوتے۔ بندہ گناہوں میں کتنا ہی لت پت کیوں نہ ہو شیطان مزید گناہ کرنے کے لیے بندے کو ضرور ورغلاتا ہے۔ بیوی کا بھی یہی حال ہے کتنی ہی اس کی فرمائشیں پوری کی جائیں راضی نہیں ہوتی بلکہ اس نے مزید فرمائشوں کی لسٹ مرتب کر کے تیار رکھی ہوتی ہیں۔ کسی کسی کے نصیب اچھے ہوتے ہیں۔ ایسے خوش نصیبوں سے اللہ راضی ہوتا ہے اور انہیں بیوی سمجھ دار ملتی ہے۔ شادی شدہ بندے کو بیوی بچوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ان کی ہر جائز مانگ پوری کرنی پڑتی ہے لیکن کنوارا ان فکروں سے آزاد ہے۔ ہم نے پہلے سال کے سوا کسی شادی شدہ بندے کو کنوارے سے خوش نہیں دیکھا۔ ہر چیز کی حقیقت تب آشکار ہوتی ہے جب اس سے نزدیکی اور آشنائی بڑھتی ہے۔ کنوارا شخص شادی کے اسرار و رموز سے تب تک واقف نہیں ہوتا جب تک خود اس آگ میں نہ کود جائے۔ البتہ شادی شدہ بندے کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ یہ بتا سکتا ہے کہ زندگی کا اصل لطف کنوارے رہ کر

اداس اور اندھیری اکیلی راتوں میں گزر بسر کرنے میں ہے یا شادی کی رنگین اور چمک دار رینوں میں نین ملانے میں۔ مرزا کہتے ہیں کہ ہر کام کرنا چاہیے تاکہ تجربہ حاصل ہو بھلے ہی وہ شادی ہی کیوں نہ ہو۔

بہت سارے افراد مجبوراً کنوارے ہوتے ہیں اور بعض مرد حادثاتی طور پر شادی شدہ۔ من پسند جیون ساتھی مل جائے تو کنوارے کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا کہ اس کے دوست احباب دعوت کا لطف لے۔ شادی شدہ کہلانے کے لیے سب سے ضروری ہے دلہن۔ جب قبول وقرار کے بعد باضابطہ اور باقاعدہ مرد اپنا چین وسکون عورت کے نام کرنے کو تیار ہو جاتا ہے تو اس ضابطے کو شادی کا نام دیا جاتا ہے۔ شادی ہونے کے بعد مرد سانس بھی اپنے مرضی سے نہیں لیتا یہ وہم ہی نہیں بلکہ غلط فہمی بھی ہے۔ بیوی، بیوی ہوتی ہے اور وہ قدرتی معاملات میں دخل نہیں دیتی البتہ انسانی معاملات کو اپنے اختیار میں ضرور لیتی ہے۔ کنوارا کہلانے کے لیے یہ شرط نہیں کہ دلہن کا انتظام اور نکاح کا اہتمام کیا جائے۔ ہر شخص کنوارا ہوتا ہے جب تک اس کی شادی نہ کی جائے ہر شخص شادی شدہ نہیں ہوسکتا۔ مرزا کہتے ہیں کہ کنوارا ہونے کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ بیوی سے مار کھانے کی نوبت نہیں آتی۔

انسان کسی حال میں مطمئن نہیں رہتا۔ کنوارا ہے تو اس کے پاس لاکھوں ارمان اور ہزاروں سپنے ہوتے ہیں جو پورے ہو جائیں تو خوش ہونے کے بجائے نئے ارمانوں کا گھر سجا لیتا ہے۔ بڑے بڑے ارمانوں کے سوا اس سجاوٹ کی مزید تزئین کے لیے چھوٹی چھوٹی امنگیں اور آرزئیں دل میں بسا لیتا ہے۔ جو کنوارے ہیں ان کا ارمان شادی کا ہوتا ہے اور وہ ہر دوشیزاہ کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ جب ان کے یاروں دوستوں کی شادیاں ہو جاتی ہیں تو وہ اکثر عالم تنہائی میں یا باتھ روم میں، نہاتے ہوئے یہ گانا گاتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ ____

میرا یار بنا ہے دلہا اور پھول کھلے ہیں دل کے
میری بھی شادی ہوجائے دعا کرو سب مل کے

جب دعا قبول ہو جاتی ہے اور ارمان پورے ہو جاتے ہیں پھر ایک وقت آتا ہے

جب شادی ہونے کے بعد ارمانوں کی آگ کچھ سرد پڑ جاتی ہے تو ان کی زبان سے یہی نکلتا ہے کہ۔۔

شادی کر کے پھنس گیا یار اچھا خاصا تھا کنوارا

کہتے ہیں ہر کامیاب انسان کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور کامیاب ترین انسان کنوارا ہوتا ہے کیونکہ پریشان انسان ترقی نہیں کر سکتا۔ کنوارا انسان اچھا صوفی بن سکتا ہے یا اچھا دیوانہ۔ بہت سارے صوفی کرام کے بارے میں روایت ہے کہ انہوں نے شادی نہیں کی۔ وارث شاہ ہو یا بھلے شاہ یہ ثبوت نہیں ملتا کہ انہوں نے شادی کی یا نہیں۔ ہاں البتہ عشق میں مبتلا رہنے کے واضح ثبوت ہیں جو ہر کنوارے کا حق ہے۔ جتنے بھی عشقیہ قصے مشہور ہیں وہ سب کنواروں کے ہیں۔ اچھا عاشق کنوارا ہوتا ہے اور ضروری نہیں کہ اچھا کنوارا اچھا شوہر بھی ثابت ہو۔ مرزا کہتے ہیں کہ کنوارے کو یہ آزادی ہے کہ وہ اپنی محبوباؤں کا ذکر کر سکتا ہے اور اس ذکر سے جان کو خطرہ نہیں ہوتا۔ شادی شدہ محبوبہ کا ذکر کرے تو سر پھوٹنے کے قوی امکان ہے۔

کنوارا گھر سے نہیں بھاگتا ہاں شادی شدہ گھر سے بھاگ کھڑا ہو کر سکون کی تلاش میں نکل سکتا ہے۔ شادی شدہ گھر سے تنگ ہو کر بھاگ جائے تو ٹالسٹائی بن سکتا ہے۔ شیخ سعدی کا نام رہتی دنیا تک لیا جائے گا لیکن اس کی بیگم کا سراغ نہیں ملتا۔ عمر خیام نے عشقیہ رباعیاں بیوی کے لیے نہیں لکھی۔ گویا ہر شعبے میں ایسے افراد موجود ہیں جنہوں نے شادی شدہ زندگی کے بجائے غیر شادی شدہ طرز زندگی کو اہمیت دی۔ مرزا کہتے ہیں کہ بڑے لوگوں کو حق ہے کہ وہ جیسے چاہیے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ عام لوگ جب تک بیوی سے بحث مباحثہ نہیں کرتے، اس سے لڑتے جھگڑتے نہیں، بچوں کی کلکاریاں نہیں سنتے، ساس کی نصیحتیں نہیں سنتے، سالے کا تذکرہ نہیں کرتے ان کو روٹی ہضم نہیں ہوتی۔ اس لیے بہترین ہضمے کے لیے شادی ضروری ہے۔



صورت، پہچان اور پیشن گوئی

نام کے سوا کام، کردار، کاروبار اور کرتوت ہی ہے جس سے انسان کی پہچان ہوسکتی ہے۔ کسی فرد کا نام کچھ اور ہوتا ہے لیکن اس کی پہچان اس کے کام سے ہوتی ہے جیسے رستم وازہ یا شکیل ڈرائیور۔ اسی طرح کسی کی پہچان ماسٹر بنی تو کوئی میجر، سپاہی، ہوٹل والا، مستری، سبزی والا وغیرہ مشہور ہوا۔ بعض دفعہ کچھ اہل ہنر شکل دیکھ کر قیاس کی بنیاد پر کسی کا پیشہ بتانی کی کوشش کرتے ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ وہ قیاس آرائی واقعی صحیح ہوتی ہے اور وہ جو بھی پیشن گوئی اور قیاس آرائی کرتے ہیں وہ من وعن سچ ثابت ہوتی ہے۔ لیکن بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کی شکل چوری کے الزام میں دھر لیے گئے قیدی کی سی ہوتی ہے لیکن وہ بڑا پہنچا ہوا بندہ ہوتا ہے۔ اس کا کاروبار لاکھوں کروڑوں میں ہوتا ہے اور اس کے مداح لاتعداد ہوتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شکل وصورت سے شہزادہ ہوتا ہے۔ نفیس صورت اور حسین وجمیل چندے آفتاب چندے مہتاب لیکن اس کا کاروبار معمولی درجے کا ہوتا ہے اور وہ بچارا کسمپرسی کی زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں کہ ٹھگ اور چور عمدہ رخت اختیار کرتے ہیں تاکہ دوسرے آسانی کے ساتھ ان کے دھوکے میں آسکے۔ چھلیا اور دغا باز بھی اپنا حلیہ معصوم، گفتار نرم اور لباس شریفوں کا زیب تن کرتے ہیں، لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں اور انہیں لوٹنے، چکمہ دینے اور پھانسنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

ایک پروفیسر صاحب ہیں جن کی شکل وصورت معقول اور انداز معصوم ہے۔ دور

دراز کے ایک گاؤں میں سیر وتفریح کی خاطر نکلے۔تھک ہار کر ایک جگہ ستانے بیٹھ گئے۔ ہاتھ میں کوک کی بوتل جس کا گھونٹ گھونٹ تھکن کو بھگانے ، گرمی کا توڑ کرنے اور پیاس کو بجھانے کے لیے پی رہے تھے۔شومیٔ قسمت وہاں پر ایک آٹو کھڑا تھا جس میں کباڑ اور ٹوٹی پھوٹی چیزیں تھیں۔ایک خاتون آئی اور پروفیسر صاحب کی شکل صورت دیکھ کر سمجھ بیٹھی کہ یہ آٹو کے مالک ہیں۔ایک خاص اور بارعب انداز میں گویا ہوئی۔''پلاسٹک اور لوہا فی کلو کتنے میں خریدتے ہو''۔پروفیسر محو حیرت میں جب منہ تکنے لگے تو خاتون نے اور گرج دار آواز میں پوچھا'' لگتا ہے کاروبار کرنا نہیں آتا''۔کتنے میں خریدتے ہو بتاؤ۔پچھلی بار تم نے کم پیسے دیئے اس بار ایسا نہیں چلے گا۔پروفیسر صاحب تھوڑے لجائے ،تھوڑے شرمائے جب جی بھر شرما چکے تو جواب دیا کہ شریمتی جی میں کم ریٹ بالکل نہیں دوں گا تسکین خاطر رکھیے۔خاتون انجان تھی اس نے بھی پیچھا نہ چھوڑا اور پوچھ بیٹھی کہ صاف صاف بتاؤ اچھے اور معقول دام دوگے تو میں سارا کباڑ تمہیں ہی دوں گی۔پروفیسر صاحب کو ایک خوف تھا کہ بھیڑ جمع ہوگئی تو کیا ہوگا؟ اسی خوف کی بدولت خاتون کو اس کے من چاہے دام دینے پر رضامندی ظاہر کی ، مدعا یہ تھا کہ خاتون کسی طرح یہاں سے دور ہوجائے تاکہ وہ راہ فرار اختیار کر سکے۔جوں ہی خاتون نے ٹوٹی پھوٹی چیزیں لانے کے لیے گھر کا رخ کیا پروفیسر صاحب وہاں سے اسی رفتار سے نکلے جس رفتار سے بجلی کوندتی ہے اور خود سے وعدہ کیا کہ آج کے بعد آٹو ،ریڈی کے قریب بیٹھنے سے پرہیز کروں گا۔یہاں لوگ شکل دیکھ کر کچھ کو کچھ سمجھتے ہیں۔

بعض اہل کمال شکل وصورت دیکھ کر شخص کے خاندان اور کاروبار کے بارے میں جو اندازہ لگاتے ہیں وہ گمراہ کن ہوتا ہے۔ایسا متعدد بار ہوا ہے کہ کسی کی صورت کو دیکھ کر اس کی سیرت کے بارے میں جو کچھ کہا گیا وہ سراسر اور بالکل غلط نکلا۔بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ آنکھیں گھما کر بات کرتے ہیں یا جب بھی کسی کی طرف دیکھتے ہیں تو ایسے دیکھتے ہیں جیسے ایک چور اپنے مطلوبہ ہدف کی طرف دیکھتا ہے۔یہ بچارے عادت سے مجبور ہوتے ہیں۔ان جیسوں کو جب کوئی انجان اور ان سے غیر مانوس شخص دیکھ لے تو وہ ضرور

یہی سمجھ بیٹھے گا کہ یہ راہ دار اور رہزن ہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ محض شکل وصورت دیکھ کر کسی کی شناخت کرنا ایسا ہی ہے جیسے اندھے کے سامنے آئینہ رکھ کر اس سے کہنا کہ دیکھو اپنی صورت کتنے خوبصورت اور حسین وجمیل لگ رہے ہو۔ بعض اشخاص کی عادتوں یا خوبیوں میں ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی انجان اور بیگانے شخص کی محض شکل وصورت دیکھ کر اس کے بارے میں کم سے کم تین چار پیشن گوئیاں ایسی کرتے ہیں جو صرف خوابوں خیالوں یا دوسرا جنم لے کر ہی پوری ہوسکتی ہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ ہر شخص کے اندر ایک اور شخص ہوتا ہے جو باہر آنے کے لیے مچل رہا ہے۔ اس لیے کسی کے بارے میں پیشن گوئی کرنا ایسا ہی ہے جیسے سراب کو پانی سمجھنا۔ بعض لوگوں کی پیشن گوئیاں اور باتیں کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ مرزا کے مطابق بہکی بہکی اور کم فہمی کی باتیں کرنے والوں کو لوگ ولی اور خدا شناس سے کم نہیں سمجھتے ہیں۔

آج کل شکل وصورت کو دیکھ کر پہچان کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ ہر شخص کے اندرون اور بیرون میں تفاوت اور فرق ہے۔ ہر شخص نے دس پندرہ چہرے جیب میں رکھے ہیں جن کو حسب موقعہ ومحل وہ استعمال میں لاتا ہے۔ اپنے فائدے اور غرض کی خاطر کبھی مومن بنتا ہے تو کبھی شیطان کو اپنے کرتوتوں سے شرمانے پر مجبور کرتا ہے۔ انسان نے جب سے اپنے مفاد کے خاطر مختلف چہرے بدلنے شروع کئے تب سے اس کی پہچان اس کی صورت سے کرنی مشکل ہوگئی ہے۔ کچھ لوگوں کی شکل معصوم اور بھولی ہوتی ہے لیکن وہ اتنے پست فطرت ہوتے ہیں کہ شیطان بھی پناہ مانگے اور کچھ لوگوں کی شکل وصورت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہایت سفلہ ہوں گے لیکن وہ نیک سیرت اور حلیم ہوتے ہیں۔ بعض افراد ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کی شکل وصورت دیکھ کر بے تحاشا ہر شخص نصیحت کرنے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ماتھے پر قسمت کی لکیریں نہیں بلکہ نصیحت کا لفظ لکھا ہوا ہے جس کو سوائے ان کے ہر فرد پڑھ لیتا ہے اور اپنا فرض جان کر نصیحت کرنے لگتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ یتیم بچہ، بیوہ عورت، بے روزگار جوان اور غریب مرد اکثر نصیحت کی تیروں کے شکار ہوتے ہیں اور جن کی ان پر نظر پڑتی ہے ان کی زبان پر نصیحت کے چند بول آ ہی جاتے ہیں۔

آجکل شکل وصورت سے پہچان مغالطے کا سبب بھی بن سکتی ہے کہ فیشن اور

ماڈرن دور چل رہا ہے اور یہ بھی ہے کہ ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی۔اس لیے مناسب یہی ہے کہ تحقیق کے بعد دیکھا جائے کہ آدمی کی آمدنی، پیشہ اور حیثیت کیا ہے جب ہی اس کی پہچان کی جائے تا کہ صحیح پہچان کرنے میں دشواری نہ ہو اور پہچان کرنے والا رسوا نہ ہو۔البتہ پیشن گوئی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔اگر پیشن گوئی واقعی سچ ثابت ہوئی تو اس وقت جو خوشی ہوتی ہے ویسے خوشی، میدان جنگ میں جیت، دلہا بننے اور پہلی اولاد کے بعد ہی نصیب ہوتی ہے۔



اشعار کی من بھاتی شرح

۱۔ الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
میر تقی میر

تدبیریں الٹی ہو جائیں یا الٹی ہو جائے دونوں واقعات سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ الٹی سے بیمار بندہ شفا پاتا ہے لیکن عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ الٹی تدبیریں ہوں تو دوا کام نہیں آتی البتہ الٹی کا علاج دوا سے ضرور ہوتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ دوائی اصلی ہو۔ میر بھی فرما رہے ہیں کہ کچھ نہ دوا نے کام کیا۔ گویا یہ اس طرف اشارہ ہے کہ آج ہی کی طرح میر کے دور میں بھی دوائی نقلی ہوا کرتی تھی۔ گویا نقلی اور جعلی دواؤں کا کاروبار نیا نہیں بہت پرانا ہے۔ یہ نقلی دوا کا ہی اثر ہے کہ بیمار دل ٹھیک نہیں ہوا اور کام تمام ہوا۔ ورنہ اگر دوائی اصلی بنی ہوتی تو یقیناً اثر کرتی، دل کا درد ٹھیک ہوتا اور کام تمام نہ ہوا ہوتا۔ ویسے یہ ایک حقیقت ہے کہ بیمار دل ڈھنگ سے کوئی کام کر ہی نہیں سکتا۔ کوئی بھی کام ٹھیک ڈھنگ سے انجام دینے کے لیے تازہ اور مضبوط دل کے ساتھ ساتھ طاقتور جسم بھی چاہیے۔ بیمار جسم اور بیمار دل سے کام نہیں بلکہ کام تمام ہی ہوتا ہے۔

۲۔ عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
میر تقی میر

افسوس ہے ایسی جوانی پر جو رورو کاٹنی پڑے۔ خدائے سخن نے تو زندگی کے حسین و جمیل اور سنہرے دور یعنی بچپن کو سرے سے ہی حذف کر دیا اور سیدھے جوانی میں رونے لگ گئے۔ بچپن کے وہ حسین لمحات پالنے میں جھولنے سے لے کر توتلی زبان میں بات کرنے تک، معصومیت سے بھرے کھیل کھیلنا، غموں اور فکروں سے آزاد زندگی، کسی چیز کے لیے مچل جانا، کلکاریوں سے لے کر کسی ضد کے پیچھے رونا دونا، ان سب لمحات اور معاملات کا گھاٹا تو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ خیر جوانی بھی دیوانی ہوتی ہے اس میں بھی ایسی کیا افتاد پڑی کہ رونا پڑا۔ ایسا بھی بھری جوانی میں کیا خطرناک روگ لگانا کہ ہونٹوں سے ہنسی ہی غائب ہو جائے۔ کچھ نہ کچھ سنگین ہی ہوگا ورنہ عہد جوانی کون رورو کاٹتا ہے۔ ترتیب یہ ہے کہ انسان پیدا ہوتا ہے اس کا بچپن آتا ہے، لڑکپن کی دہلیز پار کرتا ہے، جوان ہوتا ہے، ظالم بڑھاپا آتا ہے اور آنکھیں موند کر اس دنیا کو خیر باد کہتا ہے۔ قاعدہ یہ نہیں کہ کوئی بوڑھا انسان جوان ہوا پھر اس کا لڑکپن آیا اور پھر بچپن۔ گویا یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ بوڑھاپے میں ہی آنکھیں بند کرنے کا وقت آتا ہے۔ کوئی کوئی بدنصیب ہوتا ہے جو بچپن میں فوت ہوتا ہے یا جوان مرگ ہوتا ہے۔

رات کو دیر سے سونے والے یا نہ سونے والے پھر دن کو بھی نہ سوئے تو بیمار ہو جائیں گے۔ پہلے تو رات کو نہیں جاگنا چاہیے۔ رات آرام کے لیے بنی ہے اور اس میں آرام ہی کرنا چاہیے۔ فضول میں الو کی طرح جاگنا کس لیے۔ یہ حقیقت ہے کہ جو رات کو دیر تک جاگتے ہیں وہ صبح دیر سے اٹھتے ہیں۔ زندگی میں یہ اصول اپنانا چاہیے کہ رات کو جلدی سونا اور صبح جلدی اٹھنا چاہیے تا کہ صبح دیگر کام انجام دیئے جا سکیں۔

۳۔ سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں

احمد فراز

پہلی بات تو یہ ہے کہ سنی سنائی باتوں پر یقین اور بھروسہ کم ہی کرنا چاہیے۔ کیا پتا جو بات سنی ہے وہ سچ ہے یا محض افواہ۔ سنا ہی تو ہے دیکھا تو نہیں ہے۔ یہاں بعض آنکھوں

دیکھے واقعات بھی جھوٹ نکل آتے ہیں۔ کچھ حرکات محض نظر کو فریب دینے اور دوسروں کا دھیان اپنی اور کھینچنے کے لیے کی جاتی ہیں۔ لوگ جسے بھی دیکھتے ہیں آنکھ بھر کر ہی دیکھتے ہیں اس میں حیران ہونی کی کیا ضرورت ہے۔ ہوسکتا ہے اس میں کوئی نقص ہو جب ہی لوگ اس کی طرف بڑی توجہ سے دیکھتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کو اکثر لوگ آنکھ بھر کر ہی دیکھتے ہیں جو کسی لحاظ سے پاشکستہ ہوں۔ امکان یہ بھی ہے کہ لوگ ہمدردی کا اظہار کر رہے ہوں اور ہمدردی کی نگاہ سے ہی اسے دیکھتے ہوں۔ رہی بات اس کے شہر میں ٹھہرنے کی یا قیام کرنیکی۔ حضور یہ سب کے علم میں ہے کہ بنا کام کے کوئی کسی شہر میں نہیں جاتا۔ انجانی جگہ پر ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں۔ شہر میں جانکار کے بغیر قیام کرنا دانش مندی نہیں۔ ویسے بھی شہروں میں چوری و چکاری، لوٹ مار اور قتل و غارت گری ہوتی رہتی ہے۔ دانائی اسی میں ہے کہ انجان شہر میں ٹھہرنا نہیں چاہیے ہاں اگر کوئی جان پہچان والا شہر میں موجود ہو تب کوئی مضائقہ نہیں۔

۴۔ سنا ہے اس کو بھی ہے شعر و شاعری سے شغف
سو ہم بھی معجزے اپنے ہنر کے دیکھتے ہیں

احمد فراز

ہر انسان کو کسی نہ کسی کام سے شغف ہوتا ہے۔ شعر و شاعری سے بھی ہوسکتا ہے۔ کسی کو مطالعے کا شوق ہوتا ہے تو کوئی سیر و تفریح سے حظ اٹھاتا ہے۔ کوئی تنہا اور گوشہ نشیں ہو کر سکون سے رہتا ہے تو کسی کو بزم طرب پسند ہے۔ اپنے اپنے شوق اور اپنی اپنی پسند ہے۔ ایک کی پسند دوسری کی ناپسند ہوسکتی ہے۔ جس طرح پسند الگ الگ ہے اسی طرح ہنر بھی جدا جدا ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ ہنر کے معجزے دیکھنے آیا ہو۔ اس کو ہنر کے معجزوں کو دیکھنے کے سوا اور کام بھی ہوسکتے ہیں۔ آخر انسان اپنے مشغلوں میں مصروف بھی تو ہوسکتا ہے۔ البتہ اگر اپنے ہنر کے معجزے خود ہی بند کمرے میں دیکھنے ہوں تو کوئی بڑا مسئلہ نہیں، دوسرے مصروف ہوسکتے ہیں اور ہمیں کسی کی مصروفیت اور تخلیہ کو خراب کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اپنے ہنر کو خود پرکھے اور دیکھے۔ جب اطمینان ہو جائے کہ ہمارا ہنر

اب پختہ ہو گیا ہے اور اس لائق ہے کہ ہم یہ دوسروں کو دکھا سکے تو پھر دوسروں کے سامنے اپنے ہنر کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

۵۔ سنا ہے ربط ہے اس کو خراب حالوں سے
سو اپنے آپ کو برباد کر کے دیکھتے ہیں

احمد فراز

جھوٹ کی عمر لمبی نہیں ہوتی۔ یہ سراسر بہتان ہے کہ کسی کو خراب حالوں سے ربط ہو سکتا ہے۔ خراب حالوں سے ہمدردی ہو سکتی ہے۔ ان کی حالت غیر کو دیکھ کر ترس آ سکتا ہے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ امیر کی ہم آہنگی امیر سے اور بدحال کے مراسم بدحال سے ہوتے ہیں۔ ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا ہے کہ امیر اور غریب میں دوستی ہو اور وہ لگاتار اور آگے بھی قائم رہے۔ کوئی دیوانا اور جنونی خود کو برباد کرنا چاہیے تو کرے لیکن یہ ہرگز جائز نہیں کہ وہ یہ حماقت کرنے کے بعد کسی اور کے سر یہ الزام لگائے کہ میں اس کے لیے برباد ہوا کیونکہ اس کو برباد لوگ اچھے لگتے ہیں۔ تباہ و برباد لوگوں کو دیکھ کر ہمدردی اور ان سے عبرت حاصل کی جاسکتی ہے ان کی بربادی اور تباہ حالی کی وجہ جان کر۔ خود کو برباد کرنے کے بہت سارے طریقے ہیں کوئی نشے کی لت میں پڑ کر برباد ہوتا ہے تو کسی کو شرط بازی لے ڈوبتی ہے۔ پتا نہیں شاعر کے ذہن میں خود کو برباد کرنے کا کون سا طریقہ گھوم رہا ہے۔ بہرحال یہ فراز کا شعر ہے تو یقیناً بادو جام کا طریقہ ہی اپنانے کا سوچا ہوگا۔ مے میں ڈوب کر بڑے بڑے سورما تباہ اور خراب حال ہوئے ہیں۔

۶۔ ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

مرزا غالب

کمال ہے کوئی شخص مرنے کے بعد کیسے یہ دیکھ اور جان سکتا ہے کہ وہ رسوا ہوا ہے۔ جاں بر شخص رسوا ہو جائے اور وہ اپنے ہوش و حواس میں ہو تو اس کو علم ہوتا ہے کہ وہ رسوا ہو رہا ہے۔ جان بحق شخص کے جسم پر مرنے کے بعد کیا کچھ بیتی ہے اس کا علم اسے نہیں

ہوتا۔لوگ تو پناہ مانگتے ہیں ایسے مرنے سے جس میں گھر والوں کو لاش تک نہیں ملتی جس کو کفنانے کے بعد وہ دفنا نہ سکے۔ یہاں غرق دریا ہونے کی خواہش کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اپنے عزیز کی قبر پسماندگان کے لیے تحفہ ہے۔ جب عزیز و اقارب جنازے میں شامل ہوتے ہیں تو نہ صرف مرنے والے کے لیے ایثال ثواب کی دعا کرتے ہیں بلکہ خود ان کا غم بھی جنازہ پڑھ کر ہلکا اور کم ہو جاتا ہے۔ اب جب جنازہ اور مزار ہی نہ ہو تو نہ ہی مرنے والے کے لیے یہ اچھی خبر ہے اور نہ لواحقین کے لیے کوئی خوش کن بات۔ مرنا تو ہر ایک کو ہے۔ اس کا مرنا افضل ہے جس کو مرنے کے بعد غسل دیا جائے، جنازہ پڑھا جائے اور گھر والوں اور عزیز و اقارب کی موجودگی میں دفنایا جائے۔ گویا مزار ہونا کسی رحمت سے کم نہیں۔ پتا نہیں مرزا کو ایسا کون سا صدمہ پہنچا کہ وہ یہ خواہش کر رہے ہیں کہ جنازہ اور مزار نہیں ہونا چاہیے۔ ایسا لگتا ہے مرزا جب یہ خواہش کر رہے تھے اس وقت شاید وہ اور ہی سوچوں میں گم اور مگن رہے ہوں گے ورنہ مرزا جیسا عاقل اور دانا شخص ہرگز ایسی خواہش کا اظہار نہ کرتا۔

۷۔ تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

علامہ اقبال

مشہور ہے کہ گھر کا بھیدی ہی لنکا ڈھاتا ہے۔ راز داں ہی راز افشا کرتا ہے بچارہ انجان شخص راز و نیاز کی باتوں کے بارے میں کیا جانے اور اس کو ان باتوں کا کیا علم۔ وہ تو ہر راز سے بے خبر ہوتا ہے۔ جان پہچان والا ہی ہر راز سے واقف ہوتا ہے۔ وہ مشورے دیتا ہے، آگے کا لائحہ عمل بتاتا ہے اور کبھی کبھار پیامی بن کر پیغام پہنچاتا ہے۔ کچھ تو من و عن وہی پیغام آگے دیتے ہیں جو ان سے کہا جائے لیکن کچھ سندیس میں نون مرچ کا تڑکا لگا کر آگے بیان کرتے ہیں۔ پیامی بھروسہ مند ہوتا ہے اور اس کو بھروسہ مند ہی رہنا چاہیے۔ جو بھی راز اس کے علم میں ہو اسے اس کو اپنے سینے میں دفن کرنا چاہیے۔ پیامی کو چاہیے کہ ایک کے راز دوسروں کو نہ بتاتا پھرے۔ وہ دوسروں کو راز بتا کر نہ صرف اپنا وقار کھو دیتا ہے بلکہ اس شخص کے بھروسہ کو بھی توڑ دیتا ہے جو اس پر اعتماد کرتا ہے۔ خطا وار کوئی بھی ہو سکتا ہے لیکن نہ

بندے کی خطا ہے نہ فرد کی۔ خطا سرکار کی ہی ہے۔ عوام تو بھولی بھالی ہے۔ جو کچھ کرتی ہے سرکار ہی کرتی ہے۔ سب کچھ کر کے اور سارا کچھ کھا کے سرکار ڈکار تک نہیں لیتی۔ پہلے زمانے میں سرکار گاؤں کو بے وقوف بناتا تھا اور خود ٹھاٹ سے رہتا تھا اب تو سرکار ملک کو بے وقوف بنا کر ٹھاٹ سے رہتے اور موج کرتے ہیں۔

۸۔ نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

مرزا غالب

خلد سے آدم کا نکلنا ہم اور آپ سنتے آئے ہیں۔ آدم کو کیوں نکالا گیا یہ قصہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں نے بھی سن رکھا ہے لیکن غالب کو بے آبرو کر کے کوچے سے کیوں نکالا گیا۔ کسی کوچے سے، علاقے سے، شہر سے، ملک سے کسی کو کیوں نکالا جاتا ہے۔ جب تک اس شخص مذکور نے کوئی ایسی خطا، غلطی نہ کی ہوگی تب تک بھلا کیوں کسی کو کوچے سے بے آبرو ہو کر نکالا جائے۔ مرزا غالب کو بے آبرو کر کے کوچے سے اس لیے نکالا گیا ہوگا کیونکہ اس نے چوری کی ہوگی۔ چور کو ہی بے عزت کر کے نکالا جاتا ہے۔ یہ بھی امکان ہے کہ اس گلی کے باسیوں کی بہو بیٹیوں کو نگاہ بد سے دیکھا ہوگا، ان کے ساتھ بدتمیزی کی ہوگی، ان کے ساتھ بداخلاقی اور غیر مہذب طریقے سے پیش آیا ہوگا یا ان کی شان میں نازیبا الفاظ استعمال کئے ہوں گے۔ جب ہی تو اس گلی سے بے آبرو ہو کر نکالا گیا۔ آج تک کسی بھی مہذب انسان کو کسی گلی، علاقے، شہر سے بے آبرو ہو کر نہیں نکالا گیا۔ مجرم، گناہ گار، بدکردار، خطاوار کو ہی بے آبرو کر کے نکالا جاتا ہے۔



ماڈرن محبوب

ہر زمانے میں عاشق پیدا ہوتے ہیں بعض عاشق داستان کا حصہ بنتے ہیں اور بعض فقط شوہر۔ عاشقی کے لیے محبوب کی ضرورت ایسے ہی پڑتی ہے جیسے گولی چلانے کے لیے بندوق کی۔ ہر چیز پرانی ہوتی ہے یا نئی اسی طرح محبوب یا روایتی ہوگا یا ماڈرن۔ روایتی محبوب اور ماڈرن محبوب میں اتنا ہی فرق ہے جتنا صادق العقول اور عیار میں۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان کو کسی نہ کسی فرد سے لگاؤ اور انسیت ہو ہی جاتی ہے۔ اس کے دل میں جب کسی کے لیے چاہت، تمنا اور پانے کی خواہش جاگ جائے اور وہ اس سے اظہار محبت کے بعد قریب ہونے کی جستجو کرنے لگے، اس کے بغیر نہ رہنے کی قسمیں کھائے، اسے اپنا بنانے کا اقرار کرلے، اس کے ساتھ جینا اور اس کے بغیر مرنے کا دم بھرلے، اس کے لیے حائل ہر دیوار مٹانے کا قصد کرلے، اس کے واسطے زمانے سے لڑنے کے لیے تیار ہو جائے، اسے عرف عام میں محبوب کہا جاتا ہے۔ شاعروں نے جو محبوب کی پہچان بتائی ہے اس کے مطابق وہ اتراتا ہوگا، نازک ہوگا، نخرے اس کے ساتویں آسمان پر ہوں گے، آسانی سے عاشق کی طرف دھیان نہ دیتا ہوگا، وعدہ خلاف، بے وفا، ناز وانداز والا، رقیب پر کرم اور سچے عاشق پر ستم کرنے والا گویا محبوب ایسی مخلوق ہے جو صرف محبوب ہوسکتا ہے انسان نہیں ہوسکتا۔ مرزا کہتے ہیں کہ شعراء کے نزدیک محبوب وہ پہیلی ہے جس کو جتنا سلجھانے کی کوشش کیجیے مزید الجھ کر الجھنوں میں ڈال دے گی۔ محبوب کسی بھی شکل وصورت اور کسی بھی قد کاٹھ کا ہوسکتا ہے۔ گورا، کالا، گندمی، چھوٹا، موٹا، لمبا، ناٹا غرض جس کی جیسی پسند اس کا ویسا محبوب۔

پرانے زمانے میں محبوب کو دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سکون ملتا تھا۔ ماڈرن محبوب کی شکل وصورت کو دیکھ کر آنکھوں کو تو ٹھنڈک ملتی ہے لیکن قلب کو سکون نہیں ملتا کہ ملاوٹ زدہ چیزوں سے سکون غارت ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ محبوب جیسا بھی ہو عاشق کی نظر سے دیکھو تو خوبصورت ہی لگتا ہے اب یہ نظریہ بدل گیا ہے کیونکہ اب عاشق دیکھے یا نہ دیکھے ماڈرن محبوب کو بناؤ سنگھار کر کے اپنے آپ کو خوبصورت بنانا ہی پڑتا ہے۔

کبھی ایسا بھی وقت تھا کہ کسی کے عادات واطوار، شکل وصورت اور اسے آمنے سامنے دیکھے بغیر محض اس کی آواز سن کر اس سے عشق ہو جاتا تھا۔ اس کی آواز اور شباہت دیکھنے کو عاشق ترس جاتا تھا۔ محبوب بھی باوفا اور پاک دامن ہوتا تھا۔ محبوب اپنے عاشق کو بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا۔ محبوب تو شہر میں یہ اعلان کرتا تھا کہ ؎

شہر میں اپنے یہ لیلیٰ نے منادی کر دی
کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو

اس منادی کے باوجود اگر کوئی گستاخ اپنے سر کو بھول کر سنگ اٹھاتا تو ایسے موقعوں پر محبوب ڈھال بنا کر ہمت، حوصلے اور بہادری کی داستان رقم کرتا تھا اور تاریخ میں اپنا نام باوفا کی صفوں میں لکھواتا تھا۔ پہلے اگرچہ دل پر اختیار نہ ہوتا تھا لیکن محبوب پر اعتبار ضرور ہوتا تھا۔ اب بقول مرزا باوفا محبوب، جانثار اور مخلص دوست، کہانی سنانے والی دادی، حیا، تمیز اور اخلاص زمانے سے ایسے غائب ہوئے ہیں جیسے بعض شاعروں کے کلام میں بحر اور نئے افسانہ نگار کے افسانوں میں کہانی سرے سے غائب ہے۔ اب حال اور چال سے چاروں جانب بے وفا ہی نظر آتے ہیں۔ مصحفی نے کہا تھا کہ ؎

جو ملا اس نے بے وفائی کی
کچھ عجب رنگ ہے زمانے کا

یہ زمانے کے رنگ نہیں بلکہ ماڈرن محبوب کے ڈھنگ ہیں کہ وہ بے وفائی کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ ہر فرد کو خوب سے خوب تر کی جستجو ہوتی ہے۔ ماڈرن محبوب اگر بے وفائی کرتا ہے تو اس کا قصور نہیں کہ اسے اپنے مستقبل کی زیادہ فکر ہوتی ہے۔

اس لیے وہ بہتر کو چھوڑ کر بہترین کا انتخاب کرتا ہے۔ اپنے بہترین مستقبل کی فکر کرنا ہر فرد کا حق ہے۔ نئی نسل مستقبل کے حوالے سے زیادہ ہی سنجیدہ ہے۔ ہر جائی کی لت شاید مستقبل کی فکر کا نتیجہ ہو۔ صاحبو! اس حقیقت پر بھی نظر رہے کہ ماڈرن محبوب بڑا چالاک ہے۔ وہ اپنے کرتوت اپنے ذمہ لینے کے لیے تیار نہیں بلکہ اس کو زمانے کی کارستانی سمجھتا ہے۔ کس ڈھیٹ پن کا مظاہرہ کر کے کہتا ہے کہ ___

اب زمانہ ہے بے وفائی کا
سیکھ لیں ہم بھی یہ ہنر شاید

صاحبو! مرزا کہتے ہیں کہ ایسے وقت سے پناہ مانگو جب عیب کو ہنر گردانا جائے اس کے بعد سمجھ لو کہ قیامت اتنی ہی دور ہے جتنا ہم سے ہمارا سایہ۔

ماڈرن محبوب اس اصول پر سختی سے عمل کرتا ہے ___

عاشقی میں بہت ضروری ہے
بے وفائی کبھی کبھی کرنا

اور وہ بے وفائی کبھی کبھی نہیں کرتا بلکہ ہمہ وقت بے وفائی کی نہر میں غوطہ زن رہتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ ماڈرن محبوب عاشقی فقط بے وفائی کرنے کے لیے ہی کرتا ہے۔ صاحبو! ماڈرن محبوب وہ مخلوق ہے جو عاشقی اور بدمعاشی میں مغائرت کو ختم کرنے کی ذمہ دار ہے۔ اس نے نہ صرف عاشق اور عشق کی کمائی ہوئی عزت کو نیلام کیا بلکہ عاشقی پر بدنما داغ لگا کر اسے بدنام کیا۔ ماڈرن محبوب کی کرتوت، کردار اور کارنامے دیکھ کر داغ دہلوی سے زیادہ اس کا یہ شعر یاد آتا ہے کہ ___

اڑ گئی یوں وفا زمانے سے
کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں

یوں تو عاشق کو اندھا کرنے کے لیے محبوب کی ایک جھلک، آنکھوں کا ہلکا سا اشارہ، کوئی مخصوص ادا، ہنس کر دیکھنا اور ابرو کا ہلکے سے اوپر اٹھانا کافی ہے لیکن ماڈرن عاشق کو دیوانہ اور پاگل بنانے کے لیے کاغذ کا چھوٹا سا ٹکڑا کافی ہے۔ جس پر فون نمبر درج ہو۔ پہلے

محبت اندھی ہوا کرتی تھی اور محبوب کی ایک جھلک کو دیکھ کر ہو جاتی تھی اب ماڈرن دور میں ایسا نہیں ہوتا۔ مرزا کہتے ہیں کہ محبت اندھی ہوتی ہے پر یقین عاشق کو اس وقت آتا ہے جب وہ اپنے ماڈرن محبوب کی صورت بنا میک اپ اور بناؤ سنگھار کے دیکھتا ہے۔ جب غازہ تازہ تازہ اترا ہوا ہو تو عاشق اپنے محبوب کی شباہت کو دیکھ کر اپنی بصارت پر شک کرتا ہے۔ پرت جب اٹھتی ہے اور ایک چہرے کے پیچھے دوسرا انجان اور نامانوس چہرہ نظر آتا ہے تو عاشق کے پاس اپنے نصیب پر رونے اور ماتم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

ماڈرن محبوب کی بہت ساری نشانیاں ہیں جن میں ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ اس کے ایک ہاتھ میں بیگ اور دوسرے ہاتھ میں فون ہوگا۔ کانوں میں بالیوں کے بجائے آئرفون لگا ہوگا۔ راہ چلتے ہوئے وہ خاموش نہیں ہوگا بلکہ اپنے ایک عدد محبوب سے باتوں میں مشغول ہوگا۔ وفا داری بشرط استواری سے اس کا ایمان اٹھ گیا ہوگا۔ اپنی تفریح اور دوسروں کی خوشی کے لیے اس کو جو بھی نمبر کی پرچی دے گا اس سے فون پر بات کرے گا۔ دوران فون اگر کسی اور عاشق کا فون آیا تو نئے محبّ کو فوراً بھائی کا درجہ دے گا۔ اس کا اصول ہوتا ہے کہ ہم نے سیکھا نہیں ایک کا ہو کے رہنا۔ اس کا کردار کا صحیح انداز فیس بک اور انسٹا گرام پر اس کے دینی پوسٹیس کو دیکھے بغیر لگانا ناممکن ہے۔ دوپٹہ سر پر نہیں بلکہ گردن پر لٹک رہا ہوگا اور جہاں سے بھی یہ چلے گا پاؤں کے نشان مٹاتا جائے گا۔ اس کا دوپٹہ راستے کی صفائی کر کے صرف ان کے اپنے پاؤں کے نشان نہیں مٹا رہا ہوتا ہے بلکہ پیچھے آنے والے عاشقوں کا بھی راستہ صاف کر رہا ہوتا ہے۔

ماڈرن عاشق اگر بے روزگار ہے تو وہ عاشقی کے لائق نہیں۔ ماڈرن عاشق کے پاس گرم جیب، نرم زبان اور نئی گاڑی ہونا لازم ہے۔ عمدہ کپڑے، عالی شان گھر رکھنے والے فرد کو ہی عاشقی کا سٹیفکیٹ ملتا ہے اور وہی عشق و عاشقی کر سکتا ہے۔ بے روزگار اور مفلوک الحال شخص پہلے تو ممکن تھا کہ عشق کر سکے اب ناممکنات میں ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ ماڈرن محبوب کثیر زر، بڑا گھر، وافر زیور اور لعل و جواہر دیکھ کر ہی کسی کو دل دیتا ہے۔



سلام نامے

شاہد نے چند مراسلے اپنے عزیزوں کو لکھیں۔جن میں ایک خط پیشہ ور کھلاڑی یعنی روزنامہ حماقت کے ایڈیٹر صاحب کو بھیجا اور ساتھ ہی یہ بھی کہلوا بھیجا کہ اب وہ زمانہ گیا جب ہم خوشامد اور جھوٹی تعریف کر کے اپنا کام نکلواتے تھے۔اب ہم سچ کا علم لے کر نکلے ہیں۔شاہد کے الزام کا پہلا تیر تو ایڈیٹر صاحب کو لگا اور دوسرے کا رخ اس نے دوست کی طرف موڑ دیا۔ایڈیٹر صاحب کے نام خط لکھ کر شاہد نے جن خیالات کا برملا اظہار کیا ان کا اندازہ خط کو پڑھ کر ہی لگایا جا سکتا ہے۔

ڈیئر ایڈیٹر صاحب

آداب

آپ کے اخبار کی زینت میری بہت ساری وزن سے خارج اور معنی سے عاری غزلیں اور نظمیں بنیں۔آپ کا یارانہ میرے ایک قریبی دوست سے تھا جس کی بدولت میری قسمت جاگی اور میری تخلیقات آپ کے اخبار میں چھپتی رہی۔مراسم کام آئے ورنہ میری بساط نہیں کہ ایسا اخبار میری تحریر چھاپے جس کا ایڈیٹر خود کو پرماتما سمجھتا ہو اور سوائے دوستوں، سفارشی بندوں اور رشتہ داروں کو خاطر میں نہ لاتا ہو۔ان دنوں میرا نظریہ تھا کہ شاعری میں وزن کی قید بے بنیاد ہے اور جو شخص وزن سے خارج شعر لکھے وہی اصلی شیر اور شاعر ہے۔اب چونکہ میرا نظریہ بدل گیا ہے اور

میں اب علم عروض کو شاعری کا لازم رکن مانتا ہوں حالانکہ میری بے وزن
شاعری اب بھی عروج پر ہے۔ مجھے اندازہ ہوا ہے کہ ایک شاعر کی تمام
خوبیاں اور خصوصیات مجھے میں ہیں۔ میں نے ایک دو سال اپنی بکری
سے متاثر ہو کر اسی سے مشابہت رکھتے ہوئے لمبے بال رکھے۔ پھر دو
سال بعد ن م راشد کے کلیات پہ نظر پڑی جس کے جلد پہ اس کی ایک عدد
تصویر نظر آئی اور میں نے گنجے پن کو شاعر کی خوبی سمجھ کر اپنا سر من وعن ویسا
کیا جیسا مذکورہ تصویر میں ن م راشد کا دیکھا۔ اپنا حلیہ سو بار بدلنے کے بعد
اور اپنی اصلی شکل وصورت بھول بیٹھنے کے بعد مجھے کسی بزرگ کا قول یاد آیا
کہ بدنام ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ میں اس پہ عمل پیرا ہوا اور ادب کو اپنی
ملکیت سمجھ کر ہر لکھنے والے سے جھگڑنے لگا۔ کبھی کبھی تو نوبت ہاتھا پائی
تک آن پہنچتی مگر میں ضبط سے کام لے کر گالی گلوچ پر اکتفا کر لیتا تھا۔ یہ
سارے حربے کرنے کے بعد میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ اب حتی الامکان
آپ کی خوشامد اور ان واسطوں سے بچوں گا جو میرے دوست نے کبھی
میری دوستی کے لیے دیے تھے اور آپ نے مان کر ان کا مان رکھا تھا۔ آپ
نے مجھے اخبار کی زینت بنایا جس سے میرے دوستوں اور محلے والوں میں
میرا رعب اور دبدبہ بڑھا۔ جب سے میری شاعری نما غزلیں آپ کے
اخبار میں چھپی محلے کے تینوں دوکاندار مجھے ادھار دینے سے اب گریز
نہیں کرتے اور نہ ہی محلے کی حسین لڑکیاں گالیاں دیتی ہیں جن کی طرف
اکثر میں اپنا نمبر کاغذ پر لکھ کر پھینکتا تھا۔ وہ کاغذ کو دیکھتی تک نہیں تھی۔ اگر
کوئی کاغذ کو اٹھاتی بھی تھی تو نمبر دیکھ کر موٹی موٹی گالیوں سے میرے
حسب نسب کو نوازتی تھی اور کاغذ کو پھاڑ ڈالتی تھی۔ اب ویسا کچھ نہیں
ہوتا۔ اب وہ میری طرف مسکرا کر نین سے چین لینے کا کھیل کھیلتی ہیں۔
نام کمانے کے ساتھ ساتھ مجھے کام بھی مل گیا ہے۔ اخبار میں چھپنے سے

میں ایک لذت سے محروم تھا جس کا مزہ مجھے فیس بک نے چکھایا۔ جب کبھی میں اب فیس بک پر اپنی لکھی ہوئی کوشش ناتمام کو پوسٹ کرتا ہوں تو آناً فاناً سو دو سو لائکس، واہ واہ، بہترین، شاندار اور زبردست کے کمنٹ ملتے ہیں۔ اس لذت کا نشہ ایک طرف اور سو شراب کی بوتلیں ایک طرف۔

مختصر عرض یہ ہے کہ وہ دن گئے جب خلیل خان فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ میرے پاس اب موبائل فون ہے جس کے پاس یہ نعمت ہے وہ اخبار کی طرف کیوں دیکھے۔

فقط

آپ کے دوست کا قریبی دوست شاہد

ایڈیٹر صاحب کو خط لکھنے کے بعد شاہد کا شکار اپنا وہ دوست بنا جو ہر بار اس کو یہ مشورہ دیتا تھا کہ بھائی شعر میں خیال تو خوب باندھا ہے مگر وزن کی کمی ہے۔ ایک عدد خط اس کے نام بھی روانہ کیا جس میں یہ عبارت درج تھی۔

پیارے دوست

ہمارے بیچ سلام کلام تو ہوتا رہتا تھا اس لیے سلام لکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ تم ہر روز مجھے یہ مشورہ دیتے تھے کہ وزن کی طرف دھیان دو میں غافل رہا لیکن جب سے ڈٹ کر کھانا شروع کیا میرے وزن میں حیرت انگیز حد تک اضافہ ہوا۔ اب میں سمجھا کہ وزن کی اہمیت شاعری میں کیوں ہے۔ جب سے میں وزن دار ہوا میری باتوں میں بھی وزن پیدا ہونے لگا۔ اب محلے میں کوئی ایسا نہیں جو میری وزنی باتوں کے وزن کا منکر ہو۔ پہلے پہل تو کوئی نہ کوئی اعتراض کرنے کی جسارت کرتا تھا اب سب میری جسامت دیکھ کر چپ رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ یہ تفصیل اس لیے لکھ رہا ہوں تاکہ تم بھی سمجھ جاؤ اور دوبارہ میری تخلیق کو پڑھنے کے بعد ناصح کے منصب پہ فائز ہونے سے گریز کرو۔ ایسا کرنا

تمہاری صحت سلامتی کے لیے از بس ضروری ہے ورنہ میری بہادری کے چرچے ہو ہی رہے ہیں ایک اور معرکہ سہی۔

فقط شاہد

اپنی بھڑاس نکالنے کے بعد شاہد کا اگلا شکار کون بنے گا ابھی یہ طے نہیں ہوا۔ جوں ہی اس کی اگلی غزل فیس بک کے ذریعے قارئین تک پہنچ جائے گی کمنٹ لکھنے والوں کے کمنٹ پڑھ کر انداز ہو جائے گا کہ اس کے بندوق سے نکلی گولی کا نشانہ کون بنے گا۔ تب تک کے لیے انتظار کریں کہ انتظار سے میٹھا کچھ نہیں۔





KOTAHIYAN

by

S. Mashooq Ahmad

انشائیہ اردو نثر کی ایک ایسی صنف ہے جس کی مماثلت "دیوانی ہنڈیا" سے کی جاسکتی ہے۔ دیوانی ہنڈیا دراصل وہ ڈش ہوتی ہے جس میں کچن میں موجود ہر قسم کی اشیائے خورد و نوش ملا کر پکائی جاتی ہے اور پکنے کے بعد اس کی خوشبو سے پورا گھر مہک اٹھتا ہے۔ اس کا ذائقہ بھی لاجواب ہوتا ہے۔ اس میں ہر چیز کی لذت کا احساس ہوتا ہے۔ اسی طرح انشائیے میں ہر صنف ادب کی آمیزش ہوتی ہے اور اسکا لطف بھی نرالا ہوتا ہے۔ اس میں تاریخ، فلسفہ، مذہبیات، خمریات، افسانہ، طنز و مزاح، پند و نصیحت اور ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ بھی کارفرما ہوتی ہے۔ انشائیے میں الفاظ کی جادوگری اور جملوں کی ساخت سے لطف اور اثر انگیزی پیدا کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی انشائیہ نگار اپنے ہمہ گیر مطالعے، ذاتی تجربات اور عمیق مشاہدات سے اپنی تحریر کو پُر لطف اور اثر انگیز بنا دیتا ہے۔

ایس معشوق احمد ایسے ہی منفرد فنکار ہیں جن کی تحریریں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں زبان پر قدرت ہے اور زندگی کے مختلف شعبوں کا بھرپور تجربہ حاصل ہے۔ ان کے یہاں ہر جملے میں ذاتی مشاہدات کا عکس نظر آتا ہے۔ یہ بھی ان کی مہارت ہی ہے کہ موصوف نے بلاوجہ یا بیجا طور پر کسی فلسفے یا منطق کی گتھی کو قاری پر لادنے کی کوشش نہیں کی، کسی گنجلک خیال یا فرسودہ مضمون کو زبردستی ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی بلکہ سیدھی سادی زبان میں نہایت معصومانہ انداز سے اپنی بات کہنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے بہت پرکشش اور رواں زبان استعمال کی ہے اور خالص اپنے دل کی باتیں کہی ہیں جو قاری کے دل میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ یہ فن بڑے تجربے اور جانفشانی کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اس ماہرانہ ترسیل میں ایس معشوق احمد بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ انکی یہ کاوش کتابی شکل میں اہل علم و دانش کی توجہ مبذول کرنے میں کامیاب رہے گی اور حلقہ علم و ادب میں اس کی خوب پذیرائی ہوگی۔ دلی مبارکباد اور نیک خواہشات کے ساتھ۔!

پروفیسر غیاث الرحمٰن (دہلی)

GNK PUBLICATIONS

Website : www.gnkpublications.com

Email : gnkpublications@gmail.com

Mob : 7006738304, 9541123110



ISBN 978-93-91606-65-7

978-93-91606-65-7

₹ 300.00

GNK Publications | GNK URDU | gnk.publications | GnkPublications